مؤسس : سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

ماہنامہ

ترجمان القرآن

دسمبر ۲۰۰۷ء

مدیر : پروفیسر خورشید احمد

ادارہ ترجمان القرآن

ماہنامہ ترجمان القرآن

جلد۱۳۴٬ عدد۱۲٬ ذی الحجہ ۱۴۲۸ھ٬ دسمبر ۲۰۰۷ء

مدیر

پروفیسر خورشید احمد

نائب مدیر

مسلم سجاد

منصورہ٬ ملتان روڈ٬ لاہور - ۵۴۷۹۰

فون: ۵۴۲۵۳۵۶ - ۰۴۲

فیکس: ۵۴۳۲۱۹۴ - ۰۴۲

ای میل: tarjuman@wol.net.pk

انتظامی امور

۵-اے٬ ذیلدار پارک٬ اچھرہ٬ لاہور - ۵۴۶۰۰

فون: ۷۵۸۷۹۱۶ - ۰۴۲

۷۰۶۵۷۶۵ - ۰۴۲

فیکس: ۷۵۸۵۵۹۰ - ۰۴۲

ای میل: tarjuman@tarjumanulquran.org

ویب: www.tarjumanulquran.org

قیمت فی شمارہ: ۲۵ روپے

زرِ سالانہ: ۲۵۰ روپے

معاونِ خصوصی: ۵۰۰۰ روپے

بیرونی ایڈیشن: ۳۵ روپے

بنگلہ دیش، بھارت ۹۰۰ روپے

ایران، مشرق وسطیٰ، مشرق بعید، یورپ، افریقہ ۱۲۰۰ روپے

امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا ۱۵۰۰ روپے

بنام ماہنامہ ترجمان القرآن

A/c No. 1957-3, UBL, Ichhra Br. LHR

زیر اہتمام: الابلاغ ٹرسٹ

محکمہ تعلیم سے منظور شدہ بحوالہ SO(A-IV)4-45/99

۶۰ سال پہلے☆

خدا کا خیال

سب سے پہلے میں آپ سب حضرات کو خدا سے ڈرنے اور اس کی ناراضی سے بچنے اور اسی کی خوشنودی چاہنے کی تلقین کرتا ہوں۔ ہماری اس دعوت کا سارا انحصار ہی تعلق باللہ اور توجہ الی اللہ پر ہے۔ کوئی شخص خدا کا کلمہ بلند کرنے کے لیے کچھ بھی نہیں کرسکتا' بلکہ سچ یہ ہے کہ خود راہِ راست پر قائم بھی نہیں رہ سکتا' اگر خدا کا خوف اس کے دل میں نہ ہو اور تقویٰ کی گرفت اس کی خواہشات پر مضبوط نہ ہو' اور اس کی تمام سعی و جہد اور دوڑ دھوپ میں رضاے الٰہی کی طلب کارفرما نہ ہو۔ دنیا میں آدمی کی راست روی کی ضامن صرف ایک ہی چیز ہے' اور وہ ہے خدا کا خیال۔ یہ خیال اگر تھوڑی دیر کے لیے بھی دل سے نکل جائے' اگر ذرا سی غفلت بھی طاری ہوجائے' تو انسان کا قدم سیدھی راہ سے ہٹنے لگتا ہے۔ پھر جسے محض راہِ راست پر چلنا ہی نہ ہو بلکہ دنیا کو اس پر چلانا اور بھٹکے ہوئے لوگوں کو اس کی طرف کھینچ کر لانا بھی ہو' اس کے لیے تو ناگزیر ہے کہ خدا سے اس کا تعلق ہر وقت مضبوط اور خدا کی طرف اس کی توجہ ہر آن مرکوز رہے' ورنہ اُس سے غافل ہوکر وہ اپنے آپ کو مصلح سمجھتے ہوئے نہ معلوم کس کس قسم کے فسادوں کا مرتکب ہوجائے گا۔ لہٰذا میری پہلی نصیحت آپ کو اور ان سب لوگوں کو جو اس تحریک میں حصہ لینا چاہیں' یہ ہے کہ اپنے ذہن میں اللہ کی ذات و صفات کا تصور ہر وقت تازہ رکھیں اور اپنے تمام کاموں میں اسی کی خوشنودی پر نظر جمائے رہیں۔ جن تحریکوں کے پیشِ نظر صرف دنیا اور اس کے معاملات ہی ہیں' وہ تو چل سکتی ہیں بغیر اس کے کہ خدا کا خیال کبھی دل میں آئے' مگر یہ تحریک ایک قدم بھی ٹھیک نہیں چل سکتی جب تک کہ اس کے خادم پورے شعور کے ساتھ خدا سے خشیت اور تقویٰ اور رضاطلبی کا تعلق نہ جوڑے رکھیں۔ (' جماعت اسلامی کی دعوت'، ابوالاعلیٰ مودودیؒ، ترجمان القرآن، جلد ۳۱، عدد ۵، ذی القعدہ ۱۳۶۷ھ، ستمبر ۱۹۴۸ء، ص ۱۳-۱۴)

☆ بعض ناگزیر وجوہ کی بنا پر ترجمان القرآن جون ۱۹۴۷ء تا جون ۱۹۴۸ء اور اکتوبر ۱۹۴۸ء تا مئی ۱۹۴۹ء شائع نہیں ہوا۔ اس لیے ان مہینوں کے لیے '۶۰ سال پہلے' دوسرے شماروں سے دیا جائے گا۔ (ادارہ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

دستوری اور سیاسی بحران اور اس کا حل

قاضی حسین احمد

۲ نومبر ۲۰۰۷ء کو جماعت اسلامی کا کُل پاکستان اجتماع ارکان شروع ہوا تو ہمیں قطعاً یہ اندیشہ نہیں تھا کہ اگلے ہی روز ہمیں نام نہاد ایمر جنسی، بالفاظِ دیگر مارشل لا کے نفاذ کی مکروہ خبر سننی پڑے گی۔ ہمارا اندازہ تھا کہ فوج، بحیثیت مجموعی اپنی کمزوریوں کے باوجود، پرویز مشرف کو ملک میں دوبارہ مارشل لا یا ماورائے آئین اقدامات کی اجازت اور مشورہ نہیں دے گی اور انھیں اس طرح کا کوئی اقدام کرنے سے باز رکھے گی لیکن افسوس کہ ہمارے اندازے غلط ثابت ہوئے۔

پرویز مشرف کو چونکہ اصل تشویش آئین کی بالادستی اور سپریم کورٹ کے ججوں کے آزادانہ فیصلوں کے بارے میں تھی، اس لیے انھوں نے صدر کے بجائے چیف آف آرمی سٹاف کی حیثیت سے اقدام کر کے آئین کو معطل کر دیا، چیف جسٹس افتخار محمد چودھری کو گھر بھیج دیا اور کچھ من پسند ججوں سے عبوری آئینی حکم نامے (PCO) کے تحت حلف اٹھوا کر ایک ایسی سپریم کورٹ بنالی جسے تمام دنیا کے سیاسی اور قانونی تجزیہ کار ایک بوگس اور جعلی ادارہ قرار دے رہے ہیں اور جس کا قیام دستور اور قانونی حکمرانی کے ہر ضابطے کے خلاف ہے۔ ملک میں اس وقت عملی طور پر عدالت عظمٰی اور چاروں صوبوں کی عدالت ہائے عالیہ معطل ہیں۔ ماتحت عدالتوں میں بھی وکلا تحریک کی وجہ سے کماحقہ کام نہیں ہو رہا۔ اس صورت حال میں یہ سوال شدت سے سر اٹھائے ہمارے سامنے کھڑا ہے کہ ایسا ملک کیسے چل سکتا ہے جہاں عدالتیں کام کرنا چھوڑ دیں، اور تمام قوانین فرد واحد کی خواہشات کے تابع بن کر رہ جائیں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ پاکستان میں اصل اقتدار ابتدا ہی سے سول اور ملٹری بیوروکریسی کے ہاتھ میں رہا ہے۔ دورِ غلامی میں برطانوی حکومت بھی غیر منقسم ہندستان میں بیوروکریسی پر نظر رکھتی تھی، تاہم وہ غلاموں کے ساتھ سلوک میں قواعد وضوابط کی پابندی کرتی تھی لیکن آزادی کے بعد پاکستان میں بیوروکریسی ہرطرح کی بندشوں سے آزاد ہوگئی' اور اس کے رویے کو حدود کا پابند رکھنے کا کوئی ادارہ نہیں بن سکا جس سے مطلق العنان سول اور ملٹری بیوروکریسی خودسر ہوتی گئی۔

سپریم کورٹ اور چیف جسٹس افتخار محمد چودھری کا سب سے بڑا جرم یہ تھا کہ انھوں نے اکڑی ہوئی گردنوں والے ان افسروں کو قانون اور آئین کے سامنے جھکانے اور انھیں ضابطے کا پابند بنانے کی کوشش کی۔ انھوں نے مفقود الخبر افراد (missing persons) کے بارے میں فوج کی خفیہ ایجنسیوں کو حکم دیا کہ انھیں عدالت میں پیش کریں۔ سپریم کورٹ نے وفاقی سیکرٹریوں اور جرنیلوں میں اسلام آباد کے پلاٹوں کی بندر بانٹ کے بارے میں بھی سوال اٹھایا کہ کس قاعدے اور ضابطے کے مطابق یہ لوگ کروڑوں روپے کی جایدادیں اونے پونے داموں سے اپنی ملکیت میں لے رہے ہیں؟

پاکستان میں بار بار کے مارشل لا کے ذریعے جمہوریت کی جو درگت بنی ہے اور آئینی ضابطوں کو جس طرح پامال کیا جاتا رہا ہے' وہ سب کے سامنے ہے۔ اس پر کچھ زیادہ کہنے یا لکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ فوجی جرنیل تو کیا' فوج کا کوئی معمولی افسر بھی اپنے آپ کو ہر قانون اور ضابطے سے بالاتر سمجھنے لگا ہے۔ پرویز مشرف نے اپنی پریس کانفرنس میں 'ایمرجنسی پلس' یا مارشل لا لگانے کی بڑی وجہ یہی بتائی ہے کہ سپریم کورٹ کے بعض ججوں کا رویہ ناقابلِ قبول تھا اور وہ اعلیٰ افسران کی توہین کے مرتکب ہو رہے تھے۔ بقول ان کے انھوں نے ماورائے قانون و دستور 'اختیارات' استعمال کیے، اور ان کی نگاہ میں معاملات کو درست کرنے کے لیے ایمرجنسی لگانا ضروری تھا۔

مگر حقیقی صورتِ حال اس کے بالکل برعکس ہے۔ آئین میں صدرِ پاکستان کو وزیراعظم کے مشورے پر مشکل صورت حال میں ایمرجنسی لگانے کا اختیار دیا گیا ہے لیکن پرویز مشرف نے یہ قدم چیف آف آرمی سٹاف کی حیثیت سے اٹھایا ہے، اور ملک میں 'ایمرجنسی پلس' کے نام سے

مارشل لا نافذ کر دیا ہے۔ یاد رہے کہ وہ پاکستان کے پہلے حکمران ہیں جنھوں نے دوسری دفعہ دستور کو معطل کرنے کے جرم کا ارتکاب کیا ہے۔ ستم یہ ہے کہ وہ پہلے قابض حکمران ہیں جنھوں نے خود اپنے آٹھ سالہ دورِ اقتدار کے خلاف مارشل لا لگایا ہے اور صرف اپنی کرسی کو بچانے کے لیے یہ کھیل کھیلا ہے۔ واضح رہے کہ آئین کے تحت ایمرجنسی کے نفاذ سے اگرچہ شہریوں کے بنیادی حقوق سلب کر لیے جاتے ہیں لیکن حکومت کو چیف جسٹس کو برطرف کرنے کا اختیار پھر بھی نہیں ملتا۔ پرویز مشرف کو بتانا چاہیے تھا کہ آئین کی وہ کون سی دفعہ ہے جو چیف آف آرمی سٹاف کو یہ اختیار دیتی ہے کہ وہ سپریم کورٹ کے رویے کو درست کرنے کے لیے مارشل لا لگا دے، اور سپریم کورٹ کے چیف جسٹس سمیت عدالت عظمیٰ اور عدالت عالیہ کے تقریباً ۶۰ ججوں کو خود ساختہ عبوری آئین کے تحت حلف نہ اٹھانے کے جرم میں عدلیہ سے نکال باہر کرے۔ دستور تو بہ صراحت حکومت کے تمام اداروں اور کارندوں کو حکم دیتا ہے کہ وہ عدالت کے فیصلوں کی بے چون و چرا تعمیل کریں۔ پرویز مشرف کا یہ اقدام وہی ماوراے آئین آخری مکّا (final punch) ہے جس کی دھمکی وہ سپریم کورٹ کو دے رہے تھے کہ اگر فیصلہ ان کے حق میں نہیں ہوا تو وہ آخری مکّا رسید کر دیں گے۔

حیرت ہے کہ پرویز مشرف نے اپنی پریس کانفرنس میں مقامی اور غیر ملکی میڈیا کے سامنے بڑی ڈھٹائی سے کہہ دیا کہ یہ کارروائی انھوں نے آئین اور قانون کے مطابق کی ہے، حالانکہ یہ سب کچھ انھوں نے چیف آف آرمی سٹاف کی حیثیت سے کیا اور آئین معطل کر کے چیف جسٹس کو ان کے منصب سے ہٹا دیا۔ نیز ہائی کورٹوں اور سپریم کورٹ کے ججوں کو پی سی او کے تحت حلف لینے کا پابند کر دیا، اور حلف نہ لینے والوں کو گھروں میں نظربند کر دیا گیا۔ یہ پوری کارروائی ہر قانون اور آئین سے بالاتر بلکہ ان سے متصادم ہے، اور آئین کی دفعہ ۶ کے تحت High Treason، یعنی بغاوت اور غداری سمجھی جائے گی۔

سب سے زیادہ تشویش ناک بات یہ ہے کہ اس پوری کارروائی میں فوج بحیثیت ادارہ شریک کر ڈالی گئی ہے۔ فوج جیسے اہم ادارے کا آئین کے خلاف کارروائی میں شریک ہونا، پوری قوم کے لیے لمحۂ فکریہ ہے۔ جس ادارے کی ضروریات پوری کرنے کے لیے غریب قوم اپنے بچوں کا پیٹ کاٹ کر قربانی دیتی رہی ہے اور جسے عوام کی روٹی، کپڑے، مکان اور تعلیم اور علاج جیسی بنیادی

ضروریات پر فوقیت دی گئی ہے، اس ادارے کے نام پر اس کا سربراہ اب اپنی قوم کے حقوق چھیننے پر تل گیا ہے۔ ان حالات میں ملک ہی نہیں، بیرونِ ملک کے سیاسی تجزیہ نگار بھی انگشت نمائی کر رہے ہیں کہ فوج کے اعلیٰ افسروں نے ایک استحصالی طبقے کی شکل اختیار کر لی ہے جس کا ہر فرد کروڑوں روپے کی جایداد کا مالک ہے۔ اس طبقے نے پوری قوم کو غربت اور جہالت کے گہرے غار میں دھکیل کر اسے غلامی اور دوسرے درجے کے شہری کی حیثیت سے زندگی گزارنے پر مجبور کر دیا ہے۔ اس طبقے کا غرور اور تکبر اس حد تک بڑھ گیا ہے کہ اگر سپریم کورٹ کا کوئی بنچ ان سے باز پرس کرنے کی ہمت کرے تو یہ اسے اپنی توہین سمجھتے ہیں۔ چنانچہ پرویز مشرف نے اپنی پریس کانفرنس میں چیف جسٹس افتخار محمد چودھری اور کچھ دوسرے ججوں پر الزام لگایا ہے کہ مفقودالخبر افراد کے بارے میں معلومات فراہم کرنے کے لیے سپریم کورٹ نے بعض اعلیٰ افسروں کو عدالت میں پیش کرنے کا حکم دے کر ان کی توہین کی ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے سندھ کے چیف سیکرٹری کا ذکر کیا جیسے کسی اعلیٰ افسر کو عدالت میں بلانا ہی کافی جرم ہے جس کی بنیاد پر عدالت عظمیٰ کے ججوں کو برطرف کیا جاسکتا ہے، اور یہ کام چیف آف آرمی سٹاف کرسکتا ہے حالانکہ آئین کے مطابق اس کا درجہ کسی صورت میں چیف جسٹس کے برابر نہیں ہوسکتا۔

ایک اور خطرناک پہلو یہ ہے کہ مارشل لا کے نفاذ کے ساتھ ہی آرمی ایکٹ میں ترمیمی آرڈی ننس جاری کر دیا گیا جس کے مطابق کسی سویلین کو بھی آرمی ایکٹ کے مطابق سزا دی جاسکتی ہے۔ اس طرح کسی بھی شہری پر دہشت گردی کا الزام لگا کر اس کا کورٹ مارشل کرنے کا راستہ کھول دیا گیا ہے۔ اٹارنی جنرل نے وضاحت کرتے ہوئے کہا ہے کہ دہشت گردی کو ختم کرنے کے لیے یہ ضروری تھا لیکن دہشت گردی کا الزام تو اس ملک میں ہر سیاسی کارکن پر بہت آسانی سے لگا دیا جاتا ہے۔ موجودہ حالات میں سیاسی کارکنوں کو دباؤ میں رکھنے کے لیے سب سے آسان حربہ یہی ہے۔

اس وقت قومی و بین الاقوامی دباؤ بڑھ رہا ہے اور پرویز مشرف سے 'ایمرجنسی پلس' یا مارشل لا ہٹانے کا مطالبہ کیا جا رہا ہے لیکن پرویز مشرف نے اپنی مرضی کا ایک اور قدم اٹھا کر سینیٹ کے چیئرمین محمد میاں سومرو کو عبوری وزیراعظم مقرر کر دیا ہے۔ ایک طرف وہ سینیٹ کے چیئرمین ہیں جو صدر کی عارضی یا مستقل غیر حاضری کی صورت میں دستور کے مطابق قائم مقام صدر کی

حیثیت سے چارج سنبھال سکتے ہیں، اور دوسری طرف انھی کو عبوری وزیراعظم بنا کر ایک دستوری سوال پیدا کر دیا گیا ہے کہ ایک شخص بیک وقت سینیٹ کا چیئرمین اور وزیراعظم کیسے بن سکتا ہے۔ حکومت کے نمایندے اٹارنی جنرل ملک قیوم کا کہنا ہے کہ چونکہ دستور معطل ہے اس لیے وہ عبوری وزیراعظم بن سکتے ہیں اور ساتھ ہی سینیٹ کے چیئرمین کے عہدے پر بھی برقرار رہ سکتے ہیں۔ یہ اس حقیقت کا ثبوت ہے کہ پرویز مشرف کے عہد میں نہ کوئی دستور ہے اور نہ کوئی ضابطہ اور قانون۔

اگر مغربی ممالک کے اس مطالبے کو تسلیم کر لیا جاتا ہے کہ ایمرجنسی کو ہٹا دیا جائے اور دستور بحال کر کے انتخابات کرا دیے جائیں تو یہ سوال پیدا ہوگا کہ اس دوران جو آرڈر اور ضابطے جاری کیے گئے ہیں، ان کا کیا بنے گا؟ کیونکہ اس وقت تو قومی اسمبلی بھی نہیں ہے کہ آٹھویں یا سترھویں ترمیم کی طرح کے کسی دستوری حیلے کے ذریعے مارشل لا کے ضابطوں کو سند جواز مل سکے اور غیرآئینی فعل کو جو دستور کے آرٹیکل ۶ کے مطابق غداری اور بغاوت ہے، تحفظ (indemnity) فراہم کر سکے۔ یہ صورت حال عملاً جان بوجھ کر پیدا کی گئی ہے تاکہ جمہوری سویلین حکومت قائم کرنے کے دستوری راستے بند کر دیے جائیں اور ایک نئے تازہ دم جرنیل کے لیے راستہ ہموار کیا جائے، یا دستور سے بالاتر ایک سویلین حکومت قائم کی جائے جس طرح یحییٰ خان نے ذوالفقار علی بھٹو کو چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر بنا دیا تھا۔

پرویز مشرف نے ۱۵ نومبر کو قومی اسمبلی اور ۲۰ نومبر کو صوبائی اسمبلی کو برخاست کرنے اور ۸ جنوری ۲۰۰۸ء سے پہلے انتخابات کے انعقاد کا اعلان کیا ہے لیکن انھوں نے آئین کی بحالی کی تاریخ نہیں دی اور ججوں کو بحال کرنے سے صاف انکار کر دیا ہے۔

اس وقت ایک اہم سوال یہ ہے کہ موجودہ حالات میں جب کہ ملک میں مارشل لا ہے، دستور معطل ہے، اعلیٰ عدالتوں کو مفلوج کر دیا گیا ہے اور ملک میں عدل و انصاف کے ادارے اور انتخابات کا انتظام فوجی آمر کی مرضی کے تابع ہیں، کیا انتخابات میں حصہ لینا چاہیے؟ اس کا فیصلہ تو سیاسی و دینی جماعتوں کی مجالس مشاورت کو گہرے غور و خوض کے بعد باہمی مشورے سے کرنا ہے لیکن اگر اپوزیشن کی تمام جماعتیں، بشمول پیپلز پارٹی اور جمعیت علماے اسلام (ف) جعلی الیکشن میں حصہ لینے کے بجاے عدلیہ کی بحالی کے لیے مشترک جدوجہد کے کسی لائحہ عمل پر متفق ہو جائیں تو

اس میں ملک وقوم کی بہتری ہے۔ حزبِ اختلاف کی تمام جماعتوں کو متفق کرنے کے لیے متحدہ مجلس عمل نے ایک قومی مجلس مشاورت بلانے کا فیصلہ کیا جس میں اپوزیشن سے تعلق رکھنے والی سیاسی اور مذہبی جماعتوں کے علاوہ سول سوسائٹی کے لیڈروں اور وکلا کی تنظیموں کے نمایندوں کو بھی دعوت دینے کا ارادہ تھا۔ لیکن میاں محمد نواز شریف کی خواہش کے احترام میں کہ یہ کانفرنس آل پارٹیز ڈیموکریٹک موومنٹ کی دعوت پر ہو، مولانا فضل الرحمٰن صاحب اور ایم ایم اے کی دوسری جماعتوں کے مشورے کے بعد اسے ملتوی کر دیا گیا۔ جب محترمہ بے نظیر بھٹو صاحبہ نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ ان کی دعوت پر لوگ ان کے گھر پر کراچی میں جمع ہوں تو انھیں بھی ہم نے مل کر یہ مشورہ دیا کہ مناسب ہوگا کہ کسی غیر جانب دار شخصیت کے ہاں غیر رسمی طور پر ہم سب مشورے کے لیے جمع ہو جائیں۔ اس کے لیے جسٹس (ر) وجیہہ الدین صاحب کا نام بھی ہم نے اور نواز شریف صاحب نے تجویز کیا ہے لیکن تا حال اس بارے میں کوئی فیصلہ نہیں ہو سکا۔

اس پریشان کن منظر میں ایک خوش آیند بات یہ ہے کہ پاکستان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ سپریم کورٹ اور ہائی کورٹ کے ججوں کی ایک بڑی تعداد (۶۰ کے قریب) نے چیف آف آرمی سٹاف کی غیر آئینی مداخلت کو ناجائز قرار دیا ہے اور مارشل لا کے نفاذ کو چیلنج کر کے پی سی او کے تحت حلف لینے سے انکار کیا ہے۔ اس وقت قوم کا فرض ہے کہ ان بہادر اور زندہ ضمیر رکھنے والے ججوں کی پشت پر کھڑے ہو کر ان کی بحالی کی تحریک چلائیں کہ ان کی بحالی ہی آئین کی بالادستی اور حقیقی عدل وانصاف کو فراہم کرنے کا ذریعہ بنے گی۔ ایک آزاد عدلیہ کی بحالی تمام اداروں کی بحالی کا راستہ ہے اور عدلیہ کی آزادی کے لیے ضروری ہے کہ چیف جسٹس سمیت تمام جج زندہ ضمیر کے مالک ہوں۔

ہمارے خیال میں وطن عزیز کو ان حالات سے نکالنے کے لیے صرف عوامی تحریک ہی کافی نہیں ہے، بلکہ ایک متفقہ متبادل پر اتفاق بھی ضروری ہے۔ کیا موجودہ سیاسی اور مذہبی زعما اس غیر معمولی صورت حال کا ادراک کر کے ایک ہی فارمولے پر جمع ہو سکتے ہیں؟ ہمارے خیال میں چیف جسٹس افتخار محمد چودھری سمیت ان تمام ججوں کو جنھوں نے پی سی او کے تحت حلف لینے سے انکار کر کے ایک روشن مثال قائم کی ہے، بحال کر کے دستوری راستہ تلاش کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس حل پر متفق ہو کر اس کی خاطر عوام کو ساتھ لے کر پُرامن جدوجہد کرنے کی ضرورت ہے۔

پُرامن جدوجہد کے لیے ایسے طریقے اختیار کرنے کی ضرورت ہے کہ فوج اور پولیس سے تصادم کی نوبت نہ آئے اور پرامن عوامی احتجاج بھی مسلسل جاری رہے۔ جیسے گھروں پر سیاہ جھنڈے لہرانا اور متعین اوقات میں گھروں اور دکانوں سے نکل کر ایک گھنٹے کے لیے سامنے کی گلی اور سڑک پر پُرامن دھرنا دینا' یا بینر لے کر خاموش مظاہرے کرنا اور ان سرگرمیوں کے لیے محلے اور بازار میں انفرادی رابطے کے ذریعے لوگوں کو تیار کرنا۔ خطبوں اور تقریروں میں حالات پر تبصرہ کر کے لوگوں کو ملک وقوم کی اجتماعی بہتری کے لیے انفرادی آرام کو نظرانداز کر کے تھوڑی بہت مشقت اُٹھا کر کام کے لیے تیار کرنا، اور امت کے معاملات میں دل چسپی لینے کی شرعی ضرورت کا احساس دلانا، مساجد کے باہر بینر لے کر خاموش مظاہروں کے لیے کھڑے ہوجانا، وہ چند پُرامن طریقے ہیں جنھیں عام کرنے کی ضرورت ہے۔ کسی مرحلے پر گرفتاریاں پیش کرنا اور جیل بھرو تحریک بھی کارگر ثابت ہوسکتی ہے۔ اس کے لیے رضاکاروں کو تیار کرنا اور جیل جانے والے ساتھیوں کے گھروالوں اور ان کے بچوں کی نگہداشت کا مناسب نظام بنانے کی ضرورت ہے۔

پاکستان کے آئین کو اپنی روح اور الفاظ کے ساتھ پوری طرح سے بحال کرنے کے لیے اس کی چار بنیادی خصوصیتوں کو سامنے رکھنا چاہیے:

۱- پاکستان کے آئین کا پہلا اصول اسلامی نظریۂ حیات کی پابندی ہے۔ قراردادِ مقاصد میں جو پاکستان کے آئین کی بنیاد ہے، اللہ رب العالمین کی حاکمیت اعلیٰ کو تسلیم کیا گیا ہے۔ اور مقننہ اور عدلیہ اور انتظامیہ سمیت ریاست کے تمام اداروں کو پابند بنایا گیا ہے کہ وہ قرآن وسنت کی حدود میں رہ کر کاروبارِ حکومت چلائیں گے اور قانون سازی کریں گے۔

۲- پاکستان کا آئین جمہوری اور پارلیمانی طرزِ حکومت قائم کرتا ہے۔ عوام کے منتخب نمایندوں کو ریاستی نظام چلانے کا حق دیا گیا ہے اور تمام معاملات میں پارلیمنٹ کی بالادستی تسلیم کی گئی ہے۔ آئین میں ترمیم کے لیے دونوں ایوانوں کی دوتہائی اکثریت حاصل کرنا ضروری ہے۔

۳- پاکستان کا آئین وفاقی ہے اور ایوان بالا میں وفاق کی چار اکائیوں کو برابر کی نمایندگی حاصل ہے۔ قانون سازی میں صوبائی اسمبلیاں اپنے دائرۂ کار میں آزاد ہیں۔ دستور وفاق کی چار اکائیوں کو یہ اطمینان دلاتا ہے کہ وہ اپنے دائرہ کار میں خودمختار ہیں، اور ان کے اختیارات

کے بارے میں انھیں مطمئن کرنا اور حسب ضرورت ان میں اضافہ کرنا وفاق کے لیے ضروری ہے۔

۴- پاکستان کا آئین فلاحی ہے، اور عوام کے تمام طبقات کو بنیادی ضروریات روٹی کپڑا، مکان، تعلیم اور علاج کی سہولتیں اور مواقع فراہم کرنا ریاست اور معاشرے کا فرض ہے۔

بدقسمتی سے پاکستان کی کوئی حکومت اس آئین کو اس کی اصل روح کے ساتھ نافذ کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکی۔ اس کے اسلامی اصولوں کو ہمیشہ پامال کیا گیا۔ اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات عرصۂ دراز تک صیغۂ راز میں رکھی گئیں اور جب ضیاء الحق کے زمانے میں پارلیمنٹ میں مطالبہ کیا گیا کہ آئین کے تقاضے کے طور پر اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات کو پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں میں پیش کردیا جائے تو مجبوراً بندالماریوں سے انھیں نکالنا پڑا، لیکن ان سفارشات پر عمل درآمد کی کوئی سبیل نکالنے کے بجائے اسے محض گفتگو کا موضوع بنا کر دوبارہ طاق نسیاں پر رکھ دیا گیا۔ ایک بار جنرل ضیاء الحق صاحب نے علماے کرام کا کنونشن منعقد کرکے اسلامی نظام کے نفاذ کے بارے میں سفارشات طلب کیں تو جسٹس تنزیل الرحمٰن صاحب نے ہمت کرکے اسلامی نظریاتی کونسل کی ۲۸ جلدوں پر مشتمل سفارشات کا پلندا ان کے سامنے رکھ دیا کہ آپ پہلے ان سفارشات کو عملی جامہ پہنادیں، پھر مزید سفارشات طلب کریں تو ضیاء الحق صاحب بدمزہ ہوگئے۔

صوبائی خودمختاری و اختیارات نچلی سطح تک تقسیم کرنے (devolution of power) کے بہانے صوبوں سے اختیارات واپس لے لیے گئے اور بلدیاتی اداروں کو براہ راست مرکز سے کنٹرول کیا جانے لگا۔ صوبوں میں چیف سیکرٹری اور انسپکٹر جنرل پولیس کی تقرری کا قاعدہ یہ ہے کہ ان دونوں عہدوں کے لیے صوبائی حکومت سے تین تین نام طلب کرکے ان میں سے ایک کی تقرری مرکزی حکومت کردیتی ہے لیکن صوبہ سرحد میں ایم ایم اے کی حکومت کے تجویز کردہ تینوں ناموں کو چھوڑ کر اپنی پسند کے لوگوں کی تقرری کی گئی اور جب چاہا پرویز مشرف نے چیف سیکرٹری اور آئی جی کو براہ راست بلا کر احکامات صادر کیے اور جسے چاہا بیک بنبی و دوگوش تبدیل کردیا۔ سرحد اسمبلی کے منظور کیے ہوئے شریعت ایکٹ کو مسترد کروادیا گیا اور انھیں کوئی ضابطہ نافذ کرنے نہیں دیا گیا جس سے صوبہ سرحد میں دوسرے صوبوں کی نسبت اسلام کے نفاذ کے سلسلے میں کوئی امتیازی علامت ظاہر ہوسکے۔ بجلی کی رائلٹی کے سلسلے میں صوبہ سرحد کو کھلم کھلا اپنے حق سے محروم

رکھا گیا ہے اور اس سلسلے میں ٹربیونل کے فیصلے کو بھی نظرانداز کر دیا گیا۔ بلوچستان کے ساتھ بھی یہی سلوک روا رکھا گیا' بلکہ تین سال سے اسے کھلی فوج کشی کی آماج گاہ تک بنا دیا گیا ہے اور بے دردی سے عام انسانوں کو قتل کیا جا رہا ہے' یا نقل مکانی پر مجبور کر دیا گیا ہے حالانکہ صوبے کی اسمبلی نے متفقہ طور پر فوجی ایکشن بند کرنے کا مطالبہ کیا ہے۔ اس طرح آئین کو نظرانداز کر کے صوبوں کی حق تلفی کرنے کا نتیجہ یہ ہے کہ چھوٹے صوبوں میں بے چینی اور بے اطمینانی بڑھتی جا رہی ہے اور لوگ قوت کے استعمال کے ذریعے شریعت کے نفاذ اور ظلم و ناانصافی کا تدارک کرنے کا مطالبہ کرنے پر مجبور ہو رہے ہیں۔

آئین میں حکومت پاکستان کو ایک فلاحی ریاست (welfare state) قرار دیا گیا ہے جہاں تمام شہریوں کو بنیادی ضروریات فراہم کرنا ریاست کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ لیکن پاکستان میں جو معاشی پالیسیاں آج تک نافذ رہی ہیں ان کے نتیجے میں یہاں ایک بدترین قسم کا استحصالی معاشرہ وجود میں آ گیا ہے جہاں مسلسل غریب' غریب تر اور امیر' امیر تر ہوتا جا رہا ہے۔ ترقی اور خوش حالی کے بلند بانگ دعووں کے باوجود عام شہری بنیادی ضروریات سے محروم ہے۔ آبادی کا ایک تہائی غربت کی دلدل میں پھنسا ہوا ہے اور بے روزگاری مسلسل بڑھ رہی ہے۔ مہنگائی کا عفریت پوری آبادی اور خصوصیت سے غریب اور متوسط طبقات کو مسلسل ڈس رہا ہے اور آٹا، دال، سبزیاں اور گھی جیسی بنیادی اشیا بھی لوگوں کی پہنچ سے باہر ہو رہی ہیں۔ ایک اوسط درجے کے خاندان کا صرف آٹے اور دال کا خرچ ماہانہ ایک ہزار روپے سے بڑھ جاتا ہے۔ جس نے ہفتے میں ایک دن بھی گوشت کھانا ہو اور اوسطاً دو بچے زیرتعلیم ہوں اور مکان، بجلی، گیس کے بل بھی ادا کرنے ہوں اور کپڑے اور جوتے بھی استعمال کرنے ہوں تو حساب لگا لیجیے کہ کیا ۱۵ ہزار روپے میں بھی یہ ضروریات پوری ہو سکتی ہیں، اور کیا اوسط درجے کا خاندان مہینے میں ۱۵ ہزار روپیہ کما بھی سکتا ہے۔

پاکستان کو ایک حقیقی فلاحی ریاست میں تبدیل کرنے کے لیے جن انقلابی اقدامات کی ضرورت ہے' ان کی توقع موجودہ استحصالی حکمران طبقے سے قطعاً نہیں ہے۔ پاکستان کے موجودہ مسائل کا حل عوامی بیداری کے ذریعے ایک ایسی حکومت کا قیام ہے جو آئین اور قانون کی بالادستی کو خوش دلی سے تسلیم کرے، اور قانونی حدود کے اندر رہ کر اختیارات استعمال کرنے کو بنیادی اصول

کے طور پر اختیار کرے جو اقتدار اور وسائل دونوں کو امانت سمجھ کر حکمرانی کے فرائض انجام دے اور قانون، عوام اور خدا کے سامنے جواب دہ ہو۔

آئین اور قانون کی بالادستی اور عدلیہ کی آزادی کا خواب اسی وقت شرمندہ تعبیر ہوسکتا ہے جب ججوں کی تقرری میں بنیادی وصف جج کی امانت و دیانت ہو۔ جج کو صاحب ضمیر اور جرأت مند ہونا چاہیے۔ بزدل آدمی کبھی بھی انصاف فراہم نہیں کرسکتا۔ بدقسمتی سے ہمارے ہاں جرأت و بہادری اور امانت و دیانت کے بجاے جج کا معیار یہ قرار پایا ہے کہ وہ حکمرانوں کے مفادات کا محافظ اور حکمرانوں کا وفادار ہو۔ اسی لیے ایک ہردلعزیز اور بہادر چیف جسٹس افتخار محمد چودھری کو ہٹا کر ایسے لوگوں کو جج بنا دیا گیا ہے جنھوں نے آئین کی بالادستی اور حفاظت کے حلف کو توڑ کر ایک غاصب فرد کی وفاداری کا حلف اٹھانے میں کوئی عار محسوس نہیں کی۔

اس وقت تمام اپوزیشن جماعتوں کے پاس ایک ہی سیدھا اور انصاف کا راستہ موجود ہے کہ پیپلز پارٹی سمیت اے پی ڈی ایم میں شامل تمام پارٹیاں مل کر پرویز مشرف کے انتخابی ڈھونگ کا پردہ چاک کریں۔ اس جال میں پھنسنے اور جمہوریت کو مزید پانچ سال کے لیے آمر مطلق کی لونڈی بننے سے روکنے کا بروقت اقدام کریں اور انتخابات میں اسی وقت حصہ لیں جب سپریم کورٹ اور ہائی کورٹوں کا وہ نظام بحال ہو جو ۳ نومبر سے پہلے موجود تھا۔ منصفانہ انتخابات اور جمہوری عمل کے برسرکار آنے کی پہلی صورت یہ ہے کہ انتخابات میں حصہ لینے کے بجاے سپریم کورٹ اور ہائی کورٹوں کے دیانت دار اور باضمیر ججوں کی بحالی اور پی سی او کے تحت حلف اٹھانے والی عدالتوں کے خاتمے کے لیے ملک گیر عوامی مہم چلائی جائے۔ سپریم کورٹ اور چیف جسٹس افتخار محمد چودھری کی بحالی موجودہ بحران کو ختم کرنے کی شہ کلید ہے۔ وہی سپریم کورٹ یہ فیصلہ کرے کہ مارشل لا پی سی او، جس کو 'ایمرجنسی پلس' کا نام دیا گیا ہے' کی آئینی حیثیت کیا ہے؟ پرویز مشرف کیا آرمی چیف آف سٹاف اور صدر بن سکتے ہیں یا نہیں؟ عبوری حکومت کی آئینی شکل کیا بن سکتی ہے؟ اور آزاد الیکشن کمیشن کی تشکیل کیسے ہوسکتی ہے؟ اگر تمام اپوزیشن جماعتیں اس پر متفق ہوجائیں تو اس پروگرام کو بین الاقوامی تائید بھی حاصل ہوسکتی ہے، اور ملک کے اندر لاقانونیت اور آمریت کی لہر کا خاتمہ بھی ہوسکتا ہے۔

(یہ تحریر ۱۸ نومبر کو لکھی گئی)

اسلامی تحریک کا لائحہ عمل

اس لائحہ عمل [تطہیر افکار و تعمیر افکار، صالح افراد کی تلاش، تنظیم اور تربیت، اجتماعی اصلاح کی سعی، اور نظامِ حکومت کی اصلاح] کو اگر آپ اس نصب العین [اقامت دین، حکومتِ الٰہیہ یا اسلامی نظامِ زندگی کا قیام] کے ساتھ ملا کر دیکھیں تو آپ بیک نظر محسوس کرلیں گے کہ یہ لائحہ عمل اس نصب العین کا فطری تقاضا ہے اور اس کا ایک ایک جز اس کے ایک ایک گوشے پر ٹھیک ٹھیک منطبق ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جس جماعت کا وہ نصب العین ہو، اس کا یہی لائحہ عمل ہونا چاہیے اور یہی ہوسکتا ہے۔ اس کے سوا اس کا کوئی اور لائحہ عمل ہو ہی نہیں سکتا۔

اس کے چاروں اجزا آپس میں ایسا منطقی ربط رکھتے ہیں کہ ان میں سے ہر ایک دوسرے کا تقاضا کرتا ہے، ہر ایک دوسرے سے تقویت پاتا ہے، اور جس کو بھی ساقط کردیا جائے، اس کے سقوط سے ساری اسکیم خراب ہوجاتی ہے۔ جماعت کے نصب العین کا حصول اگر ممکن ہے تو ان چاروں اجزا پر بیک وقت متوازی کام اور متوازن طریقے پر کام کرنے ہی سے ممکن ہے۔ آپ اس کے جس جز کو بھی الگ کردیں گے، باقی اجزا کا کام نہ صرف کمزور اور بے اثر ہوجائے گا، بلکہ اپنے نصب العین کے لیے آپ کی جدوجہد ہی لاحاصل ہوکر رہ جائے گی۔

- اس کا پہلا جز اسلام کی خالص دعوت کو نکھار کر پیش کرتا ہے، اس کی قبولیت کے لیے عوام اور خواص کو تیار کرتا ہے، اور اس کی کامیابی کے لیے ذہنی فضا ہموار کرتا ہے۔ یہ اس تحریک کا اوّلین بنیادی کام ہے جس کے بغیر آگے کے کسی کام کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔
- اس کا دوسرا جز دعوت قبول کرنے والوں کو منظم کرتا ہے، اور ان کی قوتوں کو دعوت کی توسیع میں اور اس کی کامیابی کے لیے جدوجہد کرنے میں استعمال کرتا ہے۔ یہ جز پہلے جز کا لازمی تقاضا ہے۔ دعوت دینے کے ساتھ ساتھ اگر آپ دعوت قبول کرنے والوں کو منظم نہ کرتے جائیں،

اور ان کو دعوت کے مقاصد کی تحصیل کے لیے تیار نہ کرتے رہیں، اور انھیں عملاً اس کام میں لگاتے نہ چلے جائیں تو دعوت بجائے خود بے معنی ہو جاتی ہے۔ یہی کام تو اُس مشینری کو تیار کرتا ہے جو دعوت کو کامیاب بنانے کے لیے درکار ہے۔ آخر دعوت کا حاصل کیا ہے، اگر آپ صرف پکارتے رہیں اور ان لوگوں کو جو آپ کی پکار پر لبیک کہہ کر آئیں، اکٹھا کر کے کسی کام پر نہ لگائیں۔

○ اس کا تیسرا جز معاشرے کو اسلامی نظامِ زندگی کے لیے عملی اور اخلاقی حیثیت سے تیار کرنا ہے۔ حقیقت کے اعتبار سے یہ کوئی الگ کام نہیں ہے جسے اس پروگرام میں شامل کرنے یا نہ کرنے کا کوئی سوال پیدا ہو سکے۔ دراصل یہ اسی کام کی تفصیل ہے جو لائحہ عمل کے دوسرے جز میں بیان کیا گیا ہے۔ آپ دعوت قبول کرنے والوں کو منظم کر کے اور تربیت دے کر جس کام میں لگائیں گے، وہ معاشرے کی اصلاح ہی کا کام تو ہوگا۔ معاشرے کی اصلاح کا جتنا کام آپ کریں گے آپ کی دعوت وسیع ہوگی اور آپ کی تنظیم کے لیے مزید کارکن ملیں گے، اور آپ کی دعوت و تنظیم جتنی وسیع ہوگی، اتنا ہی معاشرے کی اصلاح کا دائرہ پھیلتا جائے گا اور اسلامی نظامِ زندگی کے لیے زمین ہموار ہوتی چلی جائے گی۔ اس طرح یہ دونوں اجزا بالکل ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ آپ کسی حال میں اس بات کا تصور تک نہیں کر سکتے کہ ان میں سے ایک آپ کے لائحہ عمل میں شامل ہو اور دوسرا نہ ہو۔

○ اب چوتھے جز کو لیجیے۔ یہ چاہتا ہے کہ جیسے جیسے آپ کی دعوت مقبول ہو، اور اس کے قبول کرنے والوں کی تنظیم قوت پکڑتی جائے، اور معاشرہ اس کے لیے تیار ہوتا جائے، اسی نسبت سے آپ اسلامی نظامِ زندگی کو عملاً برسرِ اقتدار لانے اور جاہلیت کی پشت پناہ طاقتوں کو پیچھے دھکیلنے کی کوشش کرتے چلے جائیں۔ اپنے اصل نصب العین کو نگاہ میں رکھ کر اگر آپ اس لائحہ عمل کے پہلے تین اجزا پر غور کریں گے تو یہ چوتھا جز ان تینوں کا ایسا فطری تقاضا نظر آئے گا کہ اگر یہ آپ کے پروگرام میں شامل نہ ہو تو وہ تینوں سراسر بے معنی ہو جائیں گے۔ آخر آپ دعوت کس چیز کی دیتے ہیں؟ اسی چیز کی نا کہ اسلامی نظامِ زندگی قائم ہو۔ اس دعوت کے قبول کرنے والوں کو منظم کرنے اور حرکت میں لانے سے آپ کا مقصد کیا ہے؟ یہی نا کہ وہ اسلامی نظامِ زندگی کے قیام کی جدوجہد کریں۔ معاشرے کو آپ کس غرض کے لیے تیار کرتے ہیں؟ اس کے سوا اور اس کی غرض کیا

ہے کہ اسلامی نظامِ زندگی کے لیے زمین ہموار ہو۔

اب خود سوچیے کہ یہ سارے کام کرنے کا فائدہ کیا ہے اگر آپ ان کاموں سے حاصل ہونے والے نتائج کو اصل مقصد کی طرف پیش قدمی کرنے کے لیے ساتھ ساتھ استعمال نہ کرتے چلے جائیں۔ آپ کا اصل مقصد آخرکار جس کام کے ذریعے سے حاصل ہونا ہے' وہ یہی چوتھا کام ہی تو ہے۔ یہ آپ کے پروگرام میں شامل نہ ہو تو پہلے تین کام ایک سعی بے حاصل کے سوا کچھ نہ ہوں گے' اور انھیں کر کے آپ زیادہ سے زیادہ بس مبلغوں کی ایک جماعت بن کر رہ جائیں گے جن کی پہلے بھی اس ملک میں کوئی کمی نہ تھی۔ اس طرح کی تبلیغ و تلقین اور اصلاح اخلاق کی کوششوں سے جاہلیّت کا سیلاب نہ پہلے رُکا تھا' نہ اب رُک سکتا ہے۔

اس تجزیہ وتشریح سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ جس نتیجۂ مطلوب کے لیے جماعت اسلامی کی یہ ساری اسکیم بنائی گئی تھی' وہ لائحہ عمل کے ان چاروں اجزا پر بیک وقت کام کرنے کا تقاضا کرتا ہے۔ اگر وہ نتیجہ فی الواقع آپ کو مطلوب ہے تو پھر اس پورے مرکب ہی پر آپ کو ایک ساتھ کام کرنا ہوگا۔ اس کے اجزا کا باہمی ربط توڑ کر' یا اس میں کمی وبیشی کر کے' یا ان میں سے بعض کو مقدم اور بعض کو مؤخر کر کے آپ اپنی تحریک کی ناکامی کے سوا اور کچھ حاصل نہ کریں گے۔

(تحریک اسلامی کا آیندہ لائحہ عمل' ص۴۴-۴۶)

مسائل کے حل کی شاہِ کلید

سیاست کا جائزہ لیں یا معیشت کا،
عام معاشرتی زندگی کا یا عائلی زندگی کا،
سرکاری محکموں کی کارکردگی دیکھیں یا جرائم کی صورت حال،
میڈیا پر جو کچھ سنایا، دکھایا اور پڑھایا جا رہا ہے، اسے دیکھیں،
عدلیہ اور پولیس سے واسطہ پڑ جائے تو کیا گزرتی ہے،

—— **ہر جگہ مسائل ہی مسائل ہیں۔**

مسائل کا ادراک تو ہے لیکن کسی بھی سطح پر مسائل حل ہوتے نظر نہیں آتے، بلکہ بڑھتے ہی جا رہے ہیں۔

ذرا گہرائی میں جا کر تجزیہ کیا جائے اور سبب تلاش کیا جائے تو ایک ہی سبب سب مسائل کی جڑ میں نظر آتا ہے: **اخلاقی زوال، اخلاقی بحران!**

اسلام کے دو عقائد: توحید اور آخرت زندگی کی بنیاد بن جائیں، ایک اللہ کے حاضر و ناظر ہونے کا یقین، دوسرے قیامت کے دن کی پیشی اور جواب دہی —— تو مسائل حل ہونا شروع ہو جائیں گے۔

اس کے لیے ضروری ہے کہ اجتماعی قیادت تقویٰ کی روش پر چلنے والی ہو اور ساتھ ہی ہر مسلمان، حقیقی مسلمان بننے کی فکر کرے۔ کوشش کرے کہ اس کی اپنی اور دوسروں کی زندگی کی تعمیر ان دو عقائد کی بنیاد پر ہو، تب ہی قرآن کی تعلیمات اور رسول اکرمؐ کے اسوۂ حسنہ پر عمل کی صورت میں مثالی نظامِ زندگی قائم ہوگا۔

توحید اور آخرت کے تصور کو زندگی کی سرگرمیوں کی بنیاد بنانا مسلمان ملک کی سرکاری پالیسی ہونا چاہیے۔

(خیر خواہ)

کلام نبویؐ کی کرنیں

مولانا عبدالمالک

حضرت اسامہ بن زیدؓ فرماتے ہیں کہ حجۃ الوداع کے موقع پر، میں جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھا۔ میں نے دیکھا کہ لوگ آپ کی خدمت میں حاضر ہو رہے ہیں۔ پھر کوئی پوچھ رہا ہے کہ میں نے طواف سے پہلے صفا و مروہ کے درمیان سعی کرلی ہے (طواف پہلے اور سعی بعد میں ہوتی ہے) یا فلاں کام پہلے کرلیا ہے تو اب مجھے کیا کرنا چاہیے۔ آپؐ نے سب کے جواب میں فرمایا کہ اس میں بھی کوئی حرج نہیں، اس میں بھی کوئی حرج نہیں، حرج تو بس اس میں ہے کہ انسان اپنے بھائی پر ظلم کرے اس کی آبرو پر حملہ کرے۔ یہ ہے وہ شخص جو حرج میں پڑ گیا اور ہلاک ہو گیا۔ (بخاری)

دین داری کے لیے لوگ نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ کو کافی سمجھتے ہیں۔ بیت اللہ شریف کے طواف، خانہ کعبہ میں داخلے، خانہ کعبہ کی چھت پر چڑھنے کے بعد سمجھتے ہیں کہ وہ جو ظلم کریں، اس سے ان کی فضیلت اور اچھا مسلمان ہونے میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ قتل و غارت گری، بے گناہوں پر کوڑے برسانا، انھیں جیلوں میں بند کرنا، کفار کے حوالے کرنا سب کچھ ان کے لیے روا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قسم کے دین داروں اور حاجیوں کو متنبہ فرمایا کہ صرف حج کے مسائل معلوم کر کے مناسکِ حج صحیح طرح سے ادا کر کے ہلاکت سے نہیں بچ سکتے، جب تک ظلم اور مسلمانوں کی آبروریزی میں مبتلا رہو گے، کوئی حج اور کوئی عمرہ اور کوئی نماز و روزہ ہلاکت سے نہیں بچا سکیں گے۔

اس حدیث سے یہ بنیادی ہدایت ملتی ہے کہ جو لوگ دینی تعلیمات کی جزئیات میں غلو، باریک بینی اور اصرار کرتے ہیں، اور کسی کا حق غصب کرنے میں، لین دین کے معاملات میں، آبرو کے تحفظ میں لاپروائی کرتے ہیں (بلکہ اس کا دین سے تعلق نہیں سمجھتے) وہ کتنی غلطی پر ہیں کہ اللہ کے رسولؐ نے ان کے لیے 'ہلاک ہو گیا' کہا۔ حج کے موقع پر حدیث کا یہ سبق یاد رکھنے کا ہے۔

○

حضرت سلمہ بن اکوع سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے مسلمانوں پر تلوار نکالی، وہ ہم میں سے نہیں ہے۔ (مسلم)

پس ایسے لوگوں سے تعلق رکھنا درست نہیں ہے۔ مسلم دشمنی، اسلام دشمنی کے مترادف ہے اور اسلام دشمنی، اللہ اور اس کے رسول سے دشمنی ہے اور اللہ اور اس کے رسولؐ کے دشمنوں سے تعلق رکھنا، ان سے محبت کرنا، ان کو ووٹ دینا، ان کی پارٹی میں شامل ہونا جائز نہیں ہے۔ یہ آج کے دور کا بہت بڑا مسئلہ ہے۔ اُمت مسلمہ کو پوری دنیا میں اس سے واسطہ ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے رہنمائی فرما دی ہے۔

○

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کو ناراض کر کے کسی کو راضی نہ کرو۔ اللہ تعالیٰ کے فضل پر کسی دوسرے کا شکر نہ ادا کرو۔ اللہ تعالیٰ نے کوئی چیز نہیں دی تو اس پر کسی دوسرے کی مذمت نہ کرو، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کا رزق تجھے کوئی دوسرا بہت زیادہ چاہت اور حرص کے باوجود نہیں دے سکتا اور اللہ تعالیٰ دینا چاہے تو کسی کی ناپسند اسے روک نہیں سکتی، اللہ تعالیٰ نے اپنے عدل و انصاف اور فضل و کرم سے راحت اور خوشی اس بات میں رکھی ہے کہ لوگ اس کے فیصلوں سے راضی ہوں اور پریشانی اور غم اس بات میں رکھا ہے کہ لوگ اس کے فیصلوں سے ناراض ہوں۔ (طبرانی)

انفرادی اور اجتماعی فیصلوں میں اللہ تعالیٰ کی رضامندی اور ناراضی کو بنیاد بنانا، انسانوں کی رضامندی اور ناراضی کو اللہ تعالیٰ کی رضامندی اور ناراضی کے تابع بنانا ایسی رہنمائی ہے جس کی ہر دور کی طرح آج بہت زیادہ ضرورت ہے۔ اس وقت اُمت مسلمہ کو جو بحران درپیش ہے، اس کا سبب اس اصول کو نظرانداز کر کے انسانوں کی رضامندی اور ناراضی کو پیش نظر رکھنا ہے۔

انسانوں کے ہاتھوں میں محدود اختیارات ہیں۔ اصل اختیار اور فیصلے اللہ کے ہاتھ میں ہیں، وہی منعم حقیقی ہے۔ اسی کے فیصلے سے رزق ملتا ہے اور اسی کے حکم سے رزق میں تنگی اور فراخی ہوتی ہے۔ اسی سے لَو لگانا چاہیے، اسی کی حمد اور شکر بجالانا چاہیے، اسی کے حکم کے مطابق چلنا چاہیے۔ اس کی مرضی کو نظرانداز کر کے دوسروں کی مرضی پورا کرنا، یہ معنی رکھتا ہے کہ اسی کو منعم اور مربی سمجھ لیا ہے حالانکہ منعم و مربی تو اللہ تعالیٰ ہے۔ دوسروں کا اسی قدر شکر کرنا چاہیے جس قدر انعام میں ان کا دخل ہے۔ ان کی مرضی کے بجاے اللہ تعالیٰ کی مرضی کو پورا کیا جائے تاکہ اس بات کا اظہار ہو کہ اللہ تعالیٰ کو منعم حقیقی سمجھا گیا ہے۔

آج کے دور میں اللہ تعالیٰ کی مرضی، اس کی پسند و ناپسند کو نظرانداز کر دیا گیا ہے۔ اس کے خوف و محبت کے بجاے انسانوں کے خوف و محبت کے زیراثر فیصلے کیے جارہے ہیں۔ اس حدیث میں اسی اہم مسئلے کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ کاش مسلمان اس کو اپنی پالیسیوں کی بنیاد بنا دیں۔

○

حضرت عائذ بن عمرو سے روایت ہے کہ وہ عبیداللہ بن زیاد کے پاس گئے اور اس سے کہا: بیٹے! میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ بُرے حکمران وہ ہوتے ہیں جو رعیت کو پیس ڈالنے، تشدد کے ذریعے ہلاک کر دینے والے ہوں۔ دیکھنا! اپنے آپ کو ان میں شامل نہ کرنا۔ (مسلم)

ظالم حکمرانوں کو سیدھی راہ دکھلانا، ان کے سامنے کلمۂ حق بیان کرنا، قرآن و حدیث کی روشنی میں سمجھانا علماے حق کا شیوہ رہا ہے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا تقاضا ہے۔ عائذ بن عمروؓ نے عبیداللہ بن زیاد کو اپنی روش بدلنے کی تلقین کی۔ آج بھی اُمت مسلمہ کو تاریخ کے بدترین ظالموں سے واسطہ ہے، ان کے سامنے کلمۂ حق کہنے والے مبارک باد کے مستحق ہیں۔ ایسے ظالموں سے نجات کے لیے کوشش کرنا اُمت مسلمہ اور دین کی سب سے بڑی خدمت ہے۔

○

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام ابومویہبہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے آدھی رات کے وقت اٹھایا اور فرمایا: ابومویہبہ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں جنت البقیع والوں کے لیے دعاے مغفرت کروں۔ تم بھی میرے ساتھ چلو (ابومویہبہ کہتے ہیں) میں آپ کے ساتھ چلا گیا۔ آپؐ جب جنت البقیع پہنچ گئے تو کھڑے ہوگئے اور قبرستان والوں کو السلام علیکم یااھل المقابر، ''قبرستان والو! تم پر سلام ہو'' کہہ کر سلام کیا اور فرمایا: تمھیں تمھاری وہ حالت جو تمھیں دوسرے لوگوں کے مقابلے میں حاصل ہے، مبارک ہو۔ اگر تمھیں ان فتنوں کی ہولناکی کا علم ہوجائے جن سے اللہ تعالیٰ نے تمھیں نجات دے دی ہے تو تمھاری خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ رہے۔ بڑے ہولناک فتنے رات کی تاریک راتوں کی دبیز تاریکیوں کی طرح تاریک اور مسلسل آئیں گے۔ ایک فتنہ ختم ہوگا تو دوسرا آجائے گا، دوسرا پہلے سے زیادہ بُرا ہوگا۔ پھر آپ میری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: ابومویہبہ مجھے اختیار دیا گیا کہ ایک طرف دنیا کے خزانے، دنیا میں

ہمیشہ ہمیشہ کی زندگی اور اس کے بعد جنت ہے اور دوسری طرف رب تعالیٰ سے ملاقات اور جنت ہے۔(ان دونوں میں سے جسے چاہیں پسند کریں آپ کو دے دی جائیں گی)

ابومویہبہ کہتے ہیں: میں نے عرض کیا: یارسولؐ اللہ! میرے ماں باپ آپؐ پر قربان' آپ دنیا کے خزانوں کی چابیاں اور اس کے ساتھ دنیا میں ہمیشہ کی زندگی پھر جنت والی صورت کو پسند کرلیجیے۔ آپؐ نے فرمایا: ابومویہبہ' اللہ کی قسم! نہیں' ایسا نہیں۔ میں نے اپنے رب سے ملاقات اور جنت کو پسند کرلیا ہے۔ پھر آپؐ نے جنت البقیع والوں کے لیے دعا کی اور واپس تشریف لے آئے۔ پھر اسی صبح کو وہ بیماری شروع ہوئی جس میں آپؐ اس دنیا سے رخصت ہوگئے۔ انا للّٰہ وانا الیہ رٰجعون (مسند احمد)

اہلِ ایمان سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کا اندازہ ان واقعات سے کیا جاسکتا ہے۔ وصال سے پہلے آپؐ نے شہداے اُحد کے لیے خصوصی اجتماعی دعا کا اہتمام فرمایا (صحیح بخاری)۔ اور جنت البقیع والوں کے لیے جنت البقیع میں جاکر دعاے مغفرت کی۔ تب ہمیں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کی روشنی میں تمام اہلِ ایمان سے محبت اور ان کے لیے دعائیں اور ہمدردی وغم گساری کی کارروائیاں کرنی چاہییں۔ دنیا کے مقابلے میں آخرت کو ترجیح دینا بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ ہے۔ آج کے دور میں اگر یہ دونوں کام سرانجام دے دیے جائیں تو اُمت مسلمہ کے تمام مصائب ومشکلات دُور ہوجائیں۔

○

حضرت مقدام بن معدی کرب سے روایت ہے' میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا: جن تھیلوں کو انسان بھرتا ہے ان میں سے پیٹ سے زیادہ بُرا کوئی تھیلا نہیں ہے۔ آدمی کے لیے چند لقمے کافی ہیں جو اس کی پیٹھ کو سیدھا رکھیں۔ اگر انسان کے بس میں نہ ہو تو پھر ایک حصّہ کھانے' ایک حصّہ پانی' اور ایک حصّہ سانس لینے کے لیے چھوڑ دے۔ (ابن ماجہ)

اگر لوگ اس حدیث پر عمل کریں تو وہ طرح طرح کی بیماریوں سے نجات پالیں' ڈاکٹروں کی دیکھ بھال سے بے نیاز ہوجائیں' اور دوائیوں کی دکانیں ویران ہوجائیں۔

قربانی

خرم مرادؒ

عیدالاضحیٰ کے موقع پر مسلمان سنت ابراہیمی کی یاد تازہ کرتے ہیں' اور اللہ کی راہ میں اپنی جان تک قربان کرنے کا عہد کرتے ہیں۔ اس موقعے پر محترم خرم مراد کی ایک انگریزی مطبوعہ تقریر Sacrifice کا ایک حصہ پیش کیا جا رہا ہے۔ (ادارہ)

قربانی کا کیا مطلب ہے؟ ہمیں کس چیز کی قربانی دینا چاہیے؟ کون سی قربانیاں دینا زیادہ مشکل ہے؟ کن قربانیوں کو عظیم قرار دیا جانا چاہیے؟

قربانی کا صاف اور سیدھا مطلب یہ ہے کہ ہم جن چیزوں سے محبت کرتے ہیں' جن کی ہماری نظروں میں کچھ قدر ہے' وہ اِس وقت ہماری ہوں' یا ہم مستقبل میں انھیں حاصل کرنے کی تمنا اور امید کرتے ہوں' انھیں چھوڑ دیں۔ یہ چیزیں محسوس اور مادی ہوسکتی ہیں' یا غیر مادی اور تصوراتی۔ مادی چیزوں میں وقت' مال' دنیاوی اشیا' جسمانی صلاحیتیں اور زندگی اہم ہیں۔ اہم تصوراتی اشیا میں ہماری محبت' خاص طور پر خاندان سے تعلقات' پسند و ناپسند' ترجیحات و تعصبات' نقطۂ نظر اور رائے' خواہشات اور تمنائیں' آرام و آسایش' مقام و منصب یا ہماری اَنا شامل ہیں۔

قربانی کا مفہوم صحیح طور پر سمجھنے کے لیے تین اصول پیش نظر رہنے چاہییں:

اوّل: کسی چیز کے چھوڑنے کو اسی وقت قربانی کہا جاسکتا ہے' جب کہ ہم اس سے محبت کرتے ہوں اور اس کے قدرداں ہوں۔ اس لیے مادی اور غیر مادی اشیا کے درمیان امتیاز کی لکیر کھینچنا مشکل ہے۔ آخری تجزیے میں ہر قربانی' محبت اور قیمتی چیز کی قربانی ہے۔ جب ہم مال' یا

زندگی، یا کوئی تعلق اللہ کی خاطر قربان کرتے ہیں تو جو شے ہم درحقیقت قربان کرتے ہیں جو اسے ایک قربانی بناتا ہے، وہ مال، زندگی یا رشتے دار کے لیے ہماری محبت ہے، نہ کہ اصل شے۔

دوم: مادی کے مقابلے میں غیر مادی اشیا کو قربان کرنا زیادہ مشکل لیکن زیادہ ضروری ہے۔

سوم: ہم کسی ایسی چیز کو جس سے ہم محبت کرتے ہیں اور جس کی قدر کرتے ہیں، کسی ایسی چیز کے لیے ہی قربان کرسکتے ہیں جس سے ہم اس سے زیادہ محبت کرتے ہوں اور اس سے زیادہ قدر کرتے ہوں۔

مادی قربانیاں

ٹھوس اشیا کی قربانیوں کی ضرورت اور اہمیت ہم جانتے پہچانتے ہیں اور تسلیم کرتے ہیں خواہ بعض وقت یہ قربانیاں نہ دے سکیں، یا دینے میں بہت مشکل محسوس کریں۔ لیکن جب ہم ایک دفعہ کسی مقصد سے وابستہ ہوجائیں تو اپنے وقت اور مقام پر ان میں سے ہر ایک کی قربانی دینا ہوتی ہے۔ اسی لیے ہمیں ذرا ٹھیر کر ان کی اہم خصوصیات پر غور کرنا چاہیے۔

وقت

وقت ہماری سب سے قیمتی شے ہے۔ ہم زندگی میں جس چیز کی بھی خواہش کریں، اسے وقت لگائے بغیر حاصل نہیں کرسکتے۔ ہم اپنا وقت، مسرت حاصل کرنے میں، پیسہ کمانے میں، دنیاوی اشیا حاصل کرنے میں، کام کرنے میں، مزے اٹھانے میں یا محض کاہلی میں کچھ نہ کر کے بھی گزار سکتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ ہم سے جس چیز کا سب سے پہلے مطالبہ کرتا ہے، وہ وقت ہے۔ اللہ کی راہ میں جدوجہد کرنے کے لیے وقت کی ضرورت ہوتی ہے۔ نماز پڑھنے میں وقت لگتا ہے۔ دعوت کا کام کرنے میں وقت خرچ ہوتا ہے۔ قرآن پڑھنے میں وقت صرف ہوتا ہے۔ مریض کی عیادت کرنے کے لیے بھی وقت چاہیے ہوتا ہے۔ ہمیں اپنا ہر لمحہ اللہ کی رضا کے حصول میں، جو اس نے عہد کیا ہے اسے پورا کرنے میں صرف کرنا چاہیے۔

لیکن اگر آپ ذرا گہرائی میں جاکر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ آپ سے دراصل جس چیز کی

قربانی مانگی جا رہی ہے، وہ وقت نہیں بلکہ وہ اشیا ہیں جن کے حصول میں آپ کا وقت خرچ ہوتا ہے۔ وہ اشیا جو آپ کی زندگی کے مقاصد کے خلاف ہوں، بے معنی، غیراہم، یا اللہ کی خاطر کیے جانے والے کاموں سے کم اہم۔ اس لیے اسلام کے لیے وقت دینے کے لیے، آپ کو سب سے پہلے وہ بہت سی اشیا قربان کرنے کے لیے تیار ہونا چاہیے جن پر آپ کا وقت لگتا ہے۔

آپ اپنے آپ کو ان چیزوں کی قربانی کے لیے اور اپنا وقت اللہ کے لیے دینے پر کس طرح آمادہ کریں؟

یاد رکھیے کہ وقت ایک ایسی چیز ہے جس کو آپ ایک لحظہ بھی نہیں ٹھیرا سکتے۔ جس طرح بھی چاہیں آپ اسے صرف کریں، یہ مسلسل آپ کے ہاتھ سے پھسلتا رہے گا۔ آپ کے لیے اس کی قیمت وہی ہے جو آپ اس سے حاصل کریں۔ وقت پگھل جائے گا، جو آپ اس سے حاصل کریں گے، وہ آپ کے ساتھ رہے گا۔

ہر لمحے اس امر کو پیش نظر رکھیے کہ وقت کا ہر لحہ ہمیشہ کی مسرت یا نہ ختم ہونے والی تکلیف میں تبدیل ہوسکتا ہے۔ یہ اس پر منحصر ہے کہ آپ اسے کس طرح صرف کرنا پسند کرتے ہیں۔ اس امر کا استحضار وقت کی قربانی دینے میں آپ کو سب سے زیادہ طاقت فراہم کرے گا۔ وہ لمحات جن کو آپ آج اپنی گرفت میں نہیں رکھ سکتے، کل آپ کو اس طرح ملیں گے کہ کبھی جدا نہ ہوں گے۔ پھر آپ ایسی چیزوں کا حصول کیوں نہ قربان کردیں جو نہ ختم ہونے والی تکلیف اور پچھتاوے میں تبدیل ہوجائیں گی۔

جب وقت گزر رہا ہو تو آپ غور کیجیے: آپ کیا پا رہے ہیں___ کوئی عارضی یا مستقل چیز؟ مسرت یا پچھتاوا؟ آپ کے وقت میں اسلام کو کتنی ترجیح حاصل ہے؟ وقت کس تناسب سے اللہ کی راہ میں لگتا ہے؟ ''اور ہر شخص یہ دیکھے کہ اس نے کل کے لیے کیا سامان کیا ہے''۔(الحشر ۵۹:۱۸)

اللہ کی راہ میں وقت کی قربانی اسلام کا جوہر ہے۔ جب بھی طلب کیا جائے، آپ کو حاضر ہونا چاہیے۔ اس لیے، آپ کو اپنے آپ کو مسلسل تربیت دینا چاہیے کہ اللہ کی راہ میں وقت دے کر، ہر چیز کی قربانی دے سکیں۔ یہ صفت آپ کے کردار پر، دن میں پانچ دفعہ نقش کی جاتی ہے۔ جمعہ کے

دن آپ کو اس طرح بیدار کیا ہے:

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، جب پکارا جائے نماز کے لیے جمعہ کے دن، تو اللہ کے ذکر کی طرف دوڑو اور خرید و فروخت چھوڑ دو، یہ تمھارے لیے زیادہ بہتر ہے اگر تم جانو۔ (الجمعہ ۶۲:۹)

مال اور دنیاوی اشیا

آپ کا بیش تر وقت مال کے یا مال کے ذریعے حاصل ہونے والی دنیاوی اشیا کے حصول کی کوشش میں صرف ہو جاتا ہے: ''لوگوں کے لیے مرغوباتِ نفس: عورتیں، اولاد، سونے چاندی کے ڈھیر، چیدہ گھوڑے، مویشی اور زرعی زمینیں بڑی خوش آیند بنادی گئی ہیں''۔(اٰل عمرٰن ۳:۱۴)

یاد رکھیے کہ دنیاوی اشیا کی یہ محبت اور خواہش نہ قابلِ مذمت ہے، نہ بری ہے۔ قرآن کی تعلیم یہ ہے کہ یہ دنیا اپنی اصل میں شر، یا خرابی نہیں ہے۔ دولت اور مال کو برا نہیں سمجھا جاتا۔ اسے خیر (اچھا) کہتے ہیں جو ایک بالکل درست بات ہے۔ اس لیے کہ اللہ اور دوسری دنیا کی نعمتوں اور برکتوں کی طرف جانے والا راستہ اس دنیا سے گزر کر جاتا ہے۔ اگر ہم اس دنیا کو ترک کر دیں، تو ہمارے پاس ان نعمتوں اور بیش بہا خزانوں کو حاصل کرنے کے لیے کچھ نہیں بچتا۔ بلاشبہہ اللہ کی رضا اور اس دنیا کے حصول کا واحد ذریعہ اور بنیاد یہی ہے۔

جو چیز اس دنیا کو شر، یا برائی بناتی ہے وہ یہ ہے کہ ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ اس دنیا کے عارضی دورانیے کے لیے یہ سب کچھ ہمیں اُس دنیا کے حقیقی اور مستقل مقاصد لیے دیا گیا ہے، جو ہر اس چیز سے بہتر ہے جو یہ دنیا دے سکتی ہے۔ جب ذرائع مقاصد بن جائیں، تو حقیقی قدر و قیمت کی اشیا کے بجاے ہمارے حصے میں دنیاوی تکالیف آتی ہیں۔ قرآن آگے کہتا ہے:

مگر یہ سب دنیا کی چند روزہ زندگی کے سامان ہیں۔ حقیقت میں جو بہتر ٹھکانا ہے، وہ تو اللہ کے پاس ہے۔ کہو: میں تمھیں بتاؤں کہ ان سے زیادہ اچھی چیز کیا ہے؟ جو لوگ تقویٰ کی روش اختیار کریں، ان کے لیے ان کے رب کے پاس باغ ہیں، جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، وہاں انھیں ہیشگی کی زندگی حاصل ہوگی، پاکیزہ بیویاں ان کی

رفیق ہوں گی اور اللہ کی رضا سے وہ سرفراز ہوں گے۔ (اٰل عمرٰن ۳:۱۴-۱۵)

اللہ کی راہ میں دنیاوی اشیا کی قربانی دینا آسان نہیں ہے۔ جب انتخاب کا واقعی موقع آئے تو بہت سے لڑکھڑا جاتے ہیں اور ناکام رہتے ہیں۔ کچھ باتوں کا یاد رکھنا، ان مشکل قربانیوں کو دینے میں آسانی پیدا کرے گا۔

اوّل: کوئی چیز بھی آپ کی نہیں ہے، ہر چیز اللہ کی ہے۔ جب آپ کوئی چیز اللہ کی راہ میں قربان کرتے ہیں تو دراصل اسے اس کے اصل مالک کی طرف لوٹا رہے ہوتے ہیں: ''آسمانوں اور زمین میں ہر چیز اللہ ہی کی ہے''۔

دوم: دنیاوی چیزوں کو آپ کتنا ہی زیادہ قدر و قیمت کا حامل کیوں نہ سمجھیں، آخری سانس کے ساتھ ہی سب کچھ ختم ہو جائے گا۔

جو کچھ تمھارے پاس ہے وہ خرچ ہو جانے والا ہے اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہی باقی رہنے والا ہے، اور ہم ضرور صبر سے کام لینے والوں کو ان کے اجر ان کے بہترین اعمال کے مطابق دیں گے۔ (النحل ۱۶:۹۶)

اور اے نبیؐ! انھیں حیاتِ دنیا کی حقیقت اس مثال سے سمجھاؤ کہ آج ہم نے آسمان سے پانی برسا دیا تو زمین کی پود خوب گھنی ہوگئی، اور کل وہی نباتات بھُس بن کر رہ گئی، جسے ہوائیں اڑائے لیے پھرتی ہیں۔ اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ یہ مال اور یہ اولاد محض دنیوی زندگی کی ایک ہنگامی آرایش (زینت) ہے۔ اصل میں تو باقی رہ جانے والی نیکیاں ہی تیرے رب کے نزدیک نتیجے کے لحاظ سے بہتر ہیں اور اُنھی سے اچھی امیدیں وابستہ کی جاسکتی ہیں۔ (الکہف ۱۸:۴۵-۴۶)

سوم: صرف اللہ کی راہ میں دینے سے آپ اسے کئی گنا زیادہ واپس پاسکتے ہیں۔

اور اللہ کو اچھا قرض دیتے رہو۔ جو کچھ بھلائی تم اپنے لیے آگے بھیجو گے اسے اللہ کے ہاں موجود پاؤ گے، وہی زیادہ بہتر ہے اور اس کا اجر بہت بڑا ہے۔ اللہ سے مغفرت مانگتے رہو، بے شک اللہ بڑا غفور و رحیم ہے۔ (المزمل ۷۳:۲۰)

جو لوگ اپنے مال اللہ کی راہ میں صرف کرتے ہیں، ان کے خرچ کی مثال ایسی ہے جیسے

ایک دانہ بویا جائے اور اس سے سات بالیں نکلیں اور ہر بالی میں سو دانے ہوں۔ اسی طرح اللہ جس کے عمل کو چاہتا ہے، افزونی عطا فرماتا ہے۔ وہ فراخ دست بھی ہے اور علیم بھی۔(البقرہ ۲:۲۶۱)

ایک لمحے کے لیے سوچیے!

اسلام سے وابستگی کے آپ کے دعووں کی کیا وقعت ہے اگر آپ کھانے پینے اور سگریٹ نوشی پر اپنے مقصد سے زیادہ خرچ کریں۔ اللہ کے وعدوں پر آپ کے یقین کی کیا حقیقت ہے اگر دنیا میں نفع کی ذرا سی بھی اُمید آپ کو اپنی کُل رقم کسی بزنس میں لگانے کے لیے آمادہ کرتی ہے، جب کہ ۷۰۰ گنا رقم کا وعدہ ___ جو کبھی واپس نہ لی جائے گی، آپ کا بٹوا نہیں کھلوا سکتا۔ آپ اپنی زندگی میں اسلام کے مقام کا تعیّن یہ جائزہ لے کر کر سکتے ہیں کہ آپ اپنی دولت کس تناسب سے اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں۔

مال کی قربانی کبھی آسان نہیں رہی۔ لیکن ہمارا دور تو ایسا دور ہے کہ جس میں صرف بہتر معیارِ زندگی، مزہ اور مسرت، صارفیت اور مادی اشیا ہی زندگی کے مقصد بن چکے ہیں۔ اس لیے آپ دیکھ بھال کر جائزہ لیں کہ کہیں آپ اس لحاظ سے ناکام نہ ہو جائیں۔

زندگی

ایک وقت آسکتا ہے جب آپ سے اللہ کی راہ میں جان کی قربانی طلب کی جائے۔ اس طرح جان دینا، شہادت کی اعلیٰ ترین قسم ہے۔ اس کے بعد آپ شہید کہلانے کا حق رکھتے ہیں۔ آپ کی زندگی، آپ کی قیمتی ترین متاع ہے۔ اس کی قربانی کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی زندگی جو کچھ دیتی ہے، یا دے سکتی ہے، تمام مادی اور غیر مادی اشیا جن کا پہلے ذکر ہوا ہے، آپ سب کچھ قربان کرنے کے لیے تیار رہیں۔

جب یہ احساس ہو جائے کہ زندگی آپ کی نہیں، اللہ کی ملکیت ہے اور جو اس کا ہے، وہ آپ کو اسے دینا چاہیے تو آپ اللہ کی راہ میں جان دینے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ آپ کو یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ موت سے نہ تو آپ بچ سکتے ہیں، نہ فرار اختیار کر سکتے ہیں۔ یہ ہمیشہ مقررہ وقت پر،

طے شدہ مقام پر طے شدہ طریقے سے آئے گی (اٰل عمرٰن ۳:۱۸۵،۱۴۴-۱۴۵-۱۴۶۔ النساء ۴:۷۸)۔
آپ کو یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ جو اللہ کی راہ میں شہید ہوتے ہیں، وہ اپنی موت سے ماورا، اپنے لیے، اپنی برادری کے لیے، اپنے مشن کے لیے ہمیشہ کی زندگی حاصل کر لیتے ہیں۔

اور جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے جائیں، اُنھیں مردہ نہ کہو، ایسے لوگ تو حقیقت میں زندہ ہیں، مگر تمھیں اُن کی زندگی کا شعور نہیں ہوتا۔ (البقرہ ۲:۱۵۴)

اس دنیا کی زندگی سے محبت نہ ہونا چاہیے، موت کا خوف نہ ہونا چاہیے، تب ہی آپ وہ طاقت حاصل کریں گے جو اپنی جان قربان کرنے کے لیے چاہیے۔ یہ صرف موت کے لیے آمادہ ہونا ہے جس سے آپ دشمن طاقتوں پر غلبہ پاسکتے ہیں۔ تب ہی کامیابی کے دروازے کھلیں گے۔ آپ مر کر زندگی حاصل کرتے ہیں، اپنے لیے، اور اپنی برادری کے لیے۔ اگر آپ مرنے کے لیے تیار نہیں ہیں، تو آپ کو زندہ رہنے کا حق نہیں رہتا، کم سے کم ایک برادری کے طور پر۔

ہم میں سے ہر ایک سے جان کی قربانی کا مطالبہ نہیں کیا جائے گا، لیکن اس کی تمنا ہر دل میں ہونی چاہیے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ شخص جو نہ اللہ کی راہ میں جہاد کرتا ہے، نہ جہاد کے بارے میں سوچتا ہے، منافق کی موت مرے گا (مسلم)۔ انھوں نے یہ بھی کہا: اس ہستی کی قسم! جس کے قبضے میں، میری جان ہے، مجھے یہ پسند ہے کہ میں اللہ کی راہ میں مارا جاؤں، پھر زندہ کیا جاؤں، پھر مارا جاؤں، پھر زندہ کیا جاؤں تاکہ ایک دفعہ پھر اللہ کی راہ میں جان دے سکوں (بخاری، مسلم)۔ (ترجمہ: مسلم سجاد)

خُرّم مُرادؒ کے قلم سے — منشورات کی شائع کردہ کتب

کتابیں:

❖ کلید البقرہ ❖ سورۃ الفاتحہ کے درس ❖ رب کا پیام ❖ تصاویر قرآنی ❖ قرآن کا راستہ
❖ آخری سورتوں کے درس ❖ قرآنی عربی کے پندرہ اسباق ❖ جنت کا سفر ❖ کلام نبوی ﷺ کی صحبت میں
❖ چہل احادیث (باہمی حقوق کے بارے میں) ❖ کارکن اور قائد سے: تحریک کے تقاضے ❖ اسلامی قیادت ❖ رہنمائی
❖ لمحات ❖ کارکنوں کے باہمی تعلقات ❖ تحریک اسلامی: اہداف، مسائل، حل ❖ مغرب اور عالم اسلام: ایک مطالعہ
❖ Who Is Muhammad? ❖ Self Development ❖ IMAGES ❖ سچی بات ❖ روزہ اور رمضان

مختصر کتابیں:

❖ نئی صلیبی جنگیں ❖ توہین رسالت ﷺ کا مقدمہ ❖ پاک امریکہ تعلقات ❖ دہشت گرد کون؟
❖ دینی مدارس کا نظام تعلیم ❖ پاکستان کہاں کھڑا ہے؟ ❖ فکر مودودی کیا ہے؟ ❖ قیام اللیل ❖ محاسبہ نفس
❖ تقویٰ کی زندگی، کامیابی کی زندگی ❖ قرب الٰہی کے چند آسان عملی طریقے ❖ رمضان کیسے گزاریں؟
❖ رمضان المبارک: مستقبل کے لیے روشنی ❖ دعوت عام کی بنیادیں ❖ تصاویر قرآنی ❖ نالہ نیم شب (کتابچہ، جیبی)
❖ یومیہ اذکار ❖ چالیس احادیث ❖ عروج کا راستہ ❖ ذکر الٰہی ❖ قرآن کا اجتماعی مطالعہ ❖ چند تصویریں:
سیرت ﷺ کے البم سے ❖ حج کا پیغام ❖ حاجی کے نام ❖ آپ ﷺ کے ہمراہ حج وداع کی داستان
❖ مؤثر تنظیم: استحکام، تنظیم کے تقاضے ❖ تعارف: جماعت اسلامی ❖ جماعت اسلامی: حکمتِ عملی، لائحہ عمل
❖ رمضان: نیکیوں کا موسم بہار مبارک ہو ❖ اللہ ہی کے ہو کر رہو! ❖ خدمت انسان، بندگی رب ❖ زندگی کا حسن:
اللہ سے محبت ❖ اجتماعی تقویٰ ❖ خدمتِ خلق ❖ انتخابات اور قوم کی ذمہ داری ❖ تربیت کی پہلی منزل
❖ عہد وفا و وفائے عہد ❖ قرآن کا پیغام ❖ دعوت کے نشان راہ ❖ شب قدر کی عظمت ❖ دور فتن میں راہِ عمل
❖ جہاد کی پکار ❖ قومی بحران کا اصل حل ❖ خرم مراد کی آخری وصیت ❖ دست شفا اور نسخہ شفا ❖ اپنی تربیت کیسے کریں؟
❖ تلاوت قرآن کے آداب ❖ انقلاب کا راستہ: ایمان، جہاد، دعوت ❖ اخلاق حسنہ ❖ جماعت اسلامی کا پیغام
❖ ائمہ مساجد ❖ دُعا: جنت کی کنجی ❖ اِحیائے اسلام اور مُعلّم ❖ ربّ سے ملاقات ❖ مسلمان معالج سے عصری تقاضے
❖ دُنیا کی زندگی کی حقیقت ❖ حج اور قربانی ❖ غلطیوں کو معاف کرنا ❖ توبہ کا دروازہ کھلا ہے ❖ اللہ کی قدرت و عظمت
❖ شرک سے پاک اللہ کی بندگی ❖ عدل و انصاف کا قیام ❖ نیکی اور بدی ❖ حسد اور بغض ❖ وعدے کی پابندی
❖ شکر اور صبر ❖ نیت اور عمل ❖ حقیقت زُہد ❖ رزق حلال ❖ امانت داری ❖ کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلانا
❖ حُب دنیا ❖ نماز کیسے بہتر کریں ❖ قرآن کے عجائب ❖ دل کی زندگی: اعمال کا مدار ❖ دین آسان ہے
❖ مغرب اور اسلام میں کش مکش: فیصلہ کن مسئلہ نبوت محمدی ﷺ ❖ صبر: جامع تصور اور نفسیاتی کیفیات
❖ احسان کا صحیح اسلامی تصور ❖ رخصت و عزیمت ❖ تحریک اسلامی کا کارکن

ووٹ کی شرعی حیثیت

مولانا عبدالمالک ○

قومی اور صوبائی اسمبلیوں کا انتخاب وہ طریقہ ہے جس سے عوام اپنی رائے اور مرضی سے اپنے حکمرانوں کو چن سکتے ہیں اور ملک کی سیاسی، معاشرتی، اخلاقی اور تہذیبی تشکیل نو کے لیے جس پروگرام کو وہ پسند کرتے ہیں اس کی علَم بردار قیادت کو بروے کار لا سکتے ہیں۔ اس عمل کو ناکام کرنے کا ایک طریقہ تو وہ ہے جو حکمران طبقے اور خصوصیت سے نظامِ حکومت پر قابض سول اور عسکری اسٹیبلشمنٹ اختیار کر رہا ہے جس میں انتخابات کی انجینیری اور قواعد وضوابط کی دھاندلی کے ذریعے پورے عمل کو سبوتاژ کرنے اور عوام کے حق حکمرانی کو غصب اور ہائی جیک کرنے کا گھناؤنا کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ دوسری طرف دین کے نام پر کچھ عناصر ووٹ، انتخاب، اسمبلیوں کے وجود ہی کو نشانہ بنا رہے ہیں اور عوام الناس کے ذہنوں کو پراگندا کرنے اور ان کو سیاسی عمل سے باہر کرنے کی مذموم کوشش کر رہے ہیں۔ یہ کھیل مشرق وسطیٰ کے کئی ممالک میں کھیلا گیا ہے جس کے نتیجے میں عام مسلمان کو الجھاؤ میں مبتلا کیا گیا ہے مگر اصل فائدہ برسرِ اقتدار عناصر کو ہوا ہے جو دینی طبقوں اور اخلاقی حِس رکھنے والے عوام کی الیکشن سے بے تعلقی کے نتیجے میں اپنے اپنے کھیل کھیلنے اور اُمت پر اپنے ظالمانہ تسلط کو قائم رکھنے میں کامیاب ہوگئے ہیں۔ دین کے نام پر اس نوعیت کی سرگرمیوں کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوا ہے کہ سیاسی نظام کی تبدیلی کے عمل ہی پر لوگوں کا اعتماد اُٹھا ہے اور تبدیلی کے جائز راستوں سے مایوس ہو کر کچھ لوگ خصوصیت سے نوجوانوں نے اپنا رخ غیر آئینی اور تشدد پر مبنی طریقوں کی طرف کر دیا ہے جس سے مزید بگاڑ پیدا ہو رہا ہے، اور ملکی اور عالمی سطح پر اسلام اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کے سامراجی کھیل کو کھل کھیلنے کا موقع مل رہا ہے۔

○ صدر، جمعیت اتحاد العلما پاکستان

دین کے نام پر اور شریعت کی اصلاحات کا استعمال کر کے سیاسی عمل کو خراب کرنے کا جو کھیل عالمِ عربی میں کھیلا گیا ہے، اب پاکستان میں بھی اس کا آغاز کر دیا گیا ہے اور انقلابی نعروں اور گمراہ کن دعوؤں کے ساتھ یہ کام کیا جا رہا ہے۔ اس سلسلے میں ایک گروہ بڑی چابک دستی سے لٹریچر پھیلا رہا ہے اور اپنے خطبوں میں بھی اس لائن کو آگے بڑھا رہا ہے کہ:

- اسمبلیاں طاغوت کی حیثیت رکھتی ہیں جو معصیت کی جگہ ہیں۔ ان میں شرکت ممنوع ہے۔
- جمہوریت شرک کی ایک شکل ہے۔
- عدالتیں دین سے بغاوت کے اصول پر کام کر رہی ہیں۔
- ووٹ ناجائز ہے، اس لیے کہ اس کے ذریعے طاغوت کا انتخاب ہوتا ہے۔

ان گمراہ کن دعوؤں کی تائید میں قرآن پاک کی آیات اور احادیث کو کھینچ تان کر استعمال کیا جا رہا ہے اور انٹرنیٹ کی جدید سہولتوں کو اس کام کے لیے بے دریغ استعمال کیا جا رہا ہے۔ ہمارے پاس ایسے لٹریچر اور دوسرے لوازمے کو تبصرے کے لیے بھیجا گیا ہے، خصوصیت سے بڑے شہروں کے کئی افراد نے اس طرف متوجہ کیا۔ اس فتنے سے قوم کو محفوظ رکھنے اور قرآن وسنت اور خلافت راشدہ کے نمونے کی روشنی میں ووٹ، انتخاب، نظام امر کے قیام اور دورِ جدید میں قانون سازی اور پالیسی سازی کے لیے مناسب طریقوں کی شرعی حیثیت کو سمجھنے کے لیے ہم نے شیخ الحدیث مولانا عبدالمالک کو دعوت دی کہ اس لٹریچر کے بارے میں جو احیاے خلافت کے نام پر گمراہ کن خیالات کا پرچار کر رہا ہے صحیح رہنمائی فرمائیں۔ مولانا عبدالمالک نے جزوی بحثوں میں الجھے بغیر اصل مسئلے کے تمام اصولی پہلوؤں پر بڑا محکم کلام کیا ہے جسے ہم قارئین ترجمان القرآن اور پاکستان کے تمام پڑھے لکھے طالبانِ حق کی رہنمائی کے لیے شائع کر رہے ہیں۔ وما علینا الا البلاغ۔ (مدیر)

قرآن وسنت اور اجماع اُمت کی رو سے یہ بات قطعیت کے ساتھ ثابت ہے کہ اللہ رب العالمین بلاشرکت غیرے کائنات کا تکوینی اور تشریعی حاکم مطلق ہے۔ اللہ تعالیٰ کے تمام انبیا اللہ تعالیٰ کے نبی ہونے کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے خلفا، یعنی نائب کی حیثیت سے مطاع اور حکمران تھے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ (النساء ۴:۶۴) ''ہم نے کسی کو رسول بنا کر نہیں بھیجا مگر اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کے اذن سے اس کی اطاعت کی جائے''۔ اللہ تعالیٰ کے پہلے خلیفہ، نبی اور رسول حضرت آدم علیہ السلام اور آخری نبی، رسول اور خلیفہ جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپؐ کی اُمت آپؐ کے نائب کی حیثیت سے اسی منصب پر فائز ہے۔ کوئی فرد یا افراد یا طبقہ خلافت کے لیے متعین نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے خلافت کے لیے انبیا اور ان کی اُمتوں کو نامزد کیا ہے۔ اُمتوں کے افراد منصب خلافت پر اُمت کے انتخاب سے فائز ہوں گے۔ یہ اہل السنّت والجماعت کا متفق علیہ فیصلہ ہے اور اہل السنّت والجماعت کا تشخص اور امتیاز بھی ہے۔ صحیح بخاری میں حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے فرمایا: میرا ارادہ تھا کہ میں آپ کے والد اور بھائی کو بلاؤں اور آپ کے والد کے بارے میں وصیّت کروں لیکن میں نے سوچا کہ اللہ تعالیٰ اور اہلِ ایمان ابوبکرؓ کے علاوہ کسی بھی شخصیت کی خلافت کا انکار کر دیں گے، اس لیے میں نے وصیّت کرنے کا ارادہ ترک کر دیا''۔ ویابی اللّٰہ والمومنون الا ابابکر، اللہ تعالیٰ کے انکار سے مراد تکوینی اور تقدیری انکار ہے اور اہلِ ایمان کے انکار سے مراد تشریعی اور رائے کا انکار ہے، یعنی مسلمان ابوبکر صدیقؓ کے علاوہ کسی بھی شخصیت کے حق میں خلافت کی رائے نہیں دیں گے، چنانچہ آپؐ کے ارشاد کے عین مطابق سقیفہ بنی ساعدہ میں خلافت کے لیے جو مجلسِ مشاورت منعقد ہوئی، اس نے بحث و مباحثے کے بعد حضرت ابوبکرؓ کے دست مبارک پر بیعت کی جس کی توثیق اگلے دن مسجد نبویؐ میں تمام مہاجرین و انصار نے متفقہ طور پر بیعت کے ذریعے کر دی۔

حضرت علیؓ کے بارے میں روایات مختلف ہیں۔ راجح یہی ہے کہ انھیں اس بات کا شکوہ تھا کہ سقیفہ بنی ساعدہ میں جو مشاورت ہوئی اس میں انھیں شریک نہیں کیا گیا لیکن حضرت ابوبکر صدیقؓ اور عمر فاروقؓ اور حضرت ابوعبیدہؓ سقیفہ بنی ساعدہ میں اچانک اطلاع پر آ گئے۔ یہ ان کا اپنا پروگرام نہیں تھا، بلکہ انصار کا پروگرام تھا جس کی اطلاع ایک بزرگ انصاری صحابیؓ سے انھیں ملی تھی جس پر وہ وہاں پر فوراً پہنچ گئے اور کسی غلط فیصلے میں رکاوٹ بن گئے۔ اس وقت انھیں یہ موقع ہی نہ مل سکا کہ وہ حضرت علیؓ کو بھی ساتھ لے جاتے۔ جب یہ حقیقت حضرت علیؓ کے سامنے آ گئی تو وہ بھی راضی ہوگئے اور انھوں نے بھی حضرت ابوبکرؓ کی بیعت کر لی۔ یہ بیعت بلاشبہہ آج کی اصطلاح میں انتخابی رائے اور ووٹ کی حیثیت رکھتی تھی۔

حضرت ابوبکرؓ نے، سقیفہ بنی ساعدہ کے اجتماع کے اگلے روز جب عمومی بیعت کے لیے

مسجد نبویؐ میں جلسہ منعقد ہوا، اس میں تقریر کرتے ہوئے لوگوں کو اختیار دیا کہ چاہو تو میری بیعت کرو اور چاہو تو کسی دوسرے کو خلیفہ منتخب کرلو لیکن مسلمانوں نے اس اختیار کو حضرت ابوبکرؓ کو منتخب کرنے کی صورت میں استعمال کیا۔ یہاں یہ سوال کیا جاسکتا ہے کہ یہ مہاجرین و انصار اور اہلِ مدینہ کا انتخاب تھا جو آج کل کے انتخاب اور ووٹنگ سے مختلف شکل ہے۔ ہر شہری کا ووٹ نہیں ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ باہر کے لوگوں اور دُور دراز کے مسلمانوں کو راے دینے کا حق تھا، انھوں نے یہ حق استعمال کیا کہ جب انھیں علم ہوا تو انھوں نے اس کی تائید کی۔ وہ اپنا حق استعمال کرنے میں مہاجرین و انصار کی قیادت پر اعتماد کرتے تھے کہ یہ وہ قیادت تھی جو قرآن پاک نے تیار کی تھی اور قرآن پاک میں ان کے فضائل و مناقب بیان کیے گئے تھے۔ اسی طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی اپنے ساتھ ابوبکرؓ و عمرؓ اور عثمانؓ و علیؓ کو رکھتے اور ان کا تذکرہ فرماتے رہتے تھے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں جو نظام جاری تھا، اس میں بھی یہی شخصیات آگے آگے ہوتی تھیں اور اسی لیے آپؐ کے بعد مسلمانوں نے انھی کو خلافت کے مناصب دیے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان ویابی اللّٰہ والمؤمنون میں بھی اسی طرف اشارہ ہے کہ حضرت ابوبکرؓ سے تمام اہلِ ایمان راضی تھے اور اگرچہ انھیں اوّلاً منتخب تو مہاجرین و انصار نے کیا تھا لیکن بعد میں بیعت تمام اہلِ ایمان نے کی اور سب نے ان کی خلافت کو تسلیم کیا۔

آج اگر کوئی ایسی قیادت پیدا ہوجائے جس کے فیصلے پر تمام لوگ اعتماد کریں تو آج بھی اس قیادت کا انتخاب معتبر ہوسکتا ہے، بلکہ آج بھی مہاجرین و انصار کی طرح ملک میں مختلف پارٹیاں ہوتی ہیں، وہ اپنے نمایندے انتخاب میں عوام کے سامنے پیش کرتی ہیں۔ پھر جس پارٹی پر عوام کو اعتماد ہو، اس کے نمایندوں کو ووٹ دیتے ہیں۔ یہ صورت اپنی شکل میں اسی شکل کے ساتھ مشابہ ہے جو خلافت راشدہ کے دور میں رائج تھی کہ مہاجرین و انصار جس کو نمایندہ مقرر کرتے، تمام اہلِ اسلام اسی کے دستِ مبارک پر بیعت کرتے، یعنی اسے ووٹ دے کر منتخب کردیتے تھے۔

یہاں یہ بات اچھی طرح سمجھ لینے کی ہے کہ ایک ہے بنیادی مسئلہ، یعنی قیادت کا معتمد علیہ ہونا اور اعتماد اور رضامندی کے بغیر حق حکمرانی کا غیر معتبر رہنا، اور دوسرا یہ معلوم کرنے کا طریقہ کہ کون معتمد علیہ ہے اور اس کا چناؤ براہ راست ہو یا بلواسطہ۔ پہلی چیز اصول کا درجہ رکھتی ہے اور دوسری

ہر دور کے حالات اور ظروف کے مطابق مناسب طریق کار کو وضع کرنے سے حاصل ہوسکتی ہے جس میں مقصد' روح اور جوہر تو ہر دور میں مشترک ہوگا مگر ظروف اور طریقے مختلف ہوسکتے ہیں۔

بات بالکل واضح ہے کہ خلافت انتخابی منصب ہے' نبی اور رسول تو اللہ تعالیٰ کے نامزد اور منتخب کردہ ہوتے ہیں لیکن نبی کے بعد خلافت کا فیصلہ اہلِ ایمان نے انتخاب کے ذریعے کرنا ہے۔ آپؐ کے بعد آپؐ کی اُمت آپؐ کی نائب ہے اور وہ اپنے اندر سے ایسے شخص کو جو خلافت کے منصب کا اہل ہو' حکومت کے لیے منتخب کرے گی کیونکہ کسی فرد کو حکومت کے لیے نامزد نہیں کیا گیا' البتہ اُمت مسلمہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے روے زمین پر حکمرانی کے لیے نامزد ہے۔ مفتی اعظم پاکستان محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ''زمین کا انتظام اور اس میں خدا کا قانون نافذ کرنے کے لیے اس کی طرف سے نائب کا مقرر ہونا' جو ان آیات سے معلوم ہوا' اس سے دستور مملکت کا اہم باب نکل آیا کہ اقتدار اعلیٰ تمام کائنات اور پوری زمین پر صرف اللہ تعالیٰ کا ہے جیسا کہ قرآن مجید میں بہت سی آیات اس پر شاہد ہیں: ان الحکم الا للّٰہ (حکمرانی نہیں ہے مگر اللہ کے لیے) اور لہ ملک السموت والارض (اور اسی کے لیے ہے اقتدار آسمانوں اور زمین کا) اور الالہ الخلق والامر (سنو اسی کا کام ہے پیدا کرنا اور حکم دینا)۔ زمین کے انتظام کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے نائب آتے ہیں' وہ باذن خداوندی زمین پر سیاست وحکومت اور بندگانِ خدا کی تعلیم وتربیت کا کام کرتے اور احکام الٰہیہ نافذ کرتے ہیں۔ اس خلیفہ کا تقرر بلاواسطہ خود حق تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے' اس میں کسی کے کسب وعمل کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ یہ خلیفہ بلاواسطہ حق تعالیٰ سے اس کے احکام معلوم کرتے اور پھر ان کو دنیا میں نافذ کرتے ہیں۔ یہ سلسلۂ خلافت و نیابت الٰہیہ کا آدم علیہ السلام سے شروع ہوکر خاتم الانبیاؐ تک اسی انداز میں چلتا رہا۔ یہاں تک کہ خاتم الانبیاؐ اس زمین پر اللہ تعالیٰ کے آخری خلیفہ ہوکر بہت سی اہم خصوصیات کے ساتھ تشریف لائے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پورے عالم اور اس کی دونوں اقوام جنات وانسان کی طرف بھیجا گیا۔ آپؐ کا اختیار واقتدار پوری دنیا کی دونوں قوموں پر حاوی ہے۔

خاتم الانبیا صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانۂ خلافت ونیابت تا قیامت ہے۔ اس لیے قیامت تک آپؐ ہی زمین پر اللہ کے خلیفہ ہیں۔ آپؐ کی وفات کے بعد نظامِ عالم کے لیے جو نائب ہوگا'

وہ خلیفۃ الرسول اور آپؐ کا نائب ہوگا۔ صحیح بخاری و مسلم کی حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کانت بنو اسرائیل تسوسہم الانبیاء کلما ھلک نبی خلفہ نبی وانہ لانبی بعدی وسیکون خلفاء فیکثرون (کتاب الانبیاء) ''بنی اسرائیل کی سیاست وحکومت ان کے انبیا کرتے تھے۔ ایک نبی فوت ہوتا تو دوسرا نبی آجاتا تھا اور خبردار رہو کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں، ہاں میرے خلیفے ہوں گے اور بہت ہوں گے''۔

خلیفۃ الرسول کا انتخاب

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ آپؐ کی اُمت کے مجموعے کو معصوم قرار دیا گیا ہے کہ آپؐ کی پوری اُمت کبھی گمراہی اور غلطی پر جمع نہ ہوگی (کذانی الموافقات للشاطبی)۔ اور جب اُمت کا مجموعہ معصوم قرار دیا گیا تو خلیفۃ الرسول کا انتخاب بھی اس کے سپرد کر دیا اور خاتم الانبیا علیہ السلام کے بعد نیابت زمین اور نظمِ حکومت کے لیے انتخاب کا طریقہ شروع ہوگیا۔ یہ اُمت جسے خلافت کے لیے منتخب کردے، وہ خلیفۃ الرسول کی حیثیت سے نظامِ عالم کا ذمہ دار ہوگا۔

اسمبلیاں

اسمبلیاں اس طرزِ عمل کا نمونہ ہیں۔ فرق اتنا ہے کہ عام جمہوری ملکوں کی اسمبلیاں اور ان کے ممبران بالکل آزاد اور خودمختار ہیں، محض اپنی راے سے جو چاہیں، اچھا یا بُرا قانون بنا سکتے ہیں، لیکن اسلامی اسمبلی اور اس کے ممبران اور منتخب کردہ امیر سب اس اصول و قانون کے پابند ہیں جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے ان کو ملا ہے۔ اس اسمبلی یا مجلسِ شوریٰ کی ممبری کے لیے بھی کچھ شرائط ہیں۔ جس شخص کو یہ منتخب کریں، ان کے لیے بھی کچھ حدود و قیود ہیں، پھر ان کی قانون سازی بھی قرآن وسنت کے بیان کردہ اصول کے دائرے میں ہوسکتی ہے، اس کے خلاف قانون بنانے کا ان کو اختیار نہیں۔ (معارف القرآن، ج اوّل، ص ۱۸۲-۱۸۶)

اس تفصیل سے ثابت ہوگیا کہ انتخاب ایک شرعی حق اور فریضہ ہے جو اس امت پر عائد ہوتا ہے۔ مفتیان دین متین نے اسے اہم الواجبات میں سے قرار دیا ہے۔ علامہ علاؤالدین الحصکفی الحنفی (م: ۱۰۸۸ھ) فرماتے ہیں: ونصبہٗ من اھم الواجبات فلذا قدموہ علی دفن صاحب

المعجزات (درمختار برحاشیہ شامی' ص ۵۱۱' ج ۱' بحث امامت)۔ امام مقرر کرنا فرائض میں سے ایک اہم فریضہ ہے' اس لیے صحابہ کرامؓ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تدفین کی تجہیز و تکفین پر اسے مقدم رکھا۔

امام ابوالحسن ماوردی الشافعی (م: ۴۵۰ھ) اور قاضی ابویعلی الحنفی (م: ۴۵۸ھ) فرماتے ہیں: وعقد الامامة لمن یقوم بها فی الامة واجب بالاجماع (الاحکام السلطانیہ' للماوردی' ص ۵' طبع مصر' ۱۹۷۳ء۔ والاحکام السلطانیہ' لابی یعلی' ص ۱۹' طبع قاہرہ' ۱۹۶۶ء)

علامہ عبدالقاہر البغدادی (م: ۴۹۲ھ) فرماتے ہیں: قال جمهور اصحابنا من المتكلمين والفقهاء مع الشيعة والخوارج واكثر المعتزلة بوجوب الامامة وانها فرض و واجب۔ (اصول الدین' طبع جامعہ اشرفیہ' لاہور' ص ۲۷۱) ہمارے اساتذہ میں سے جمہور علما' علم العقائد اور فقہا نے اسی طرح شیعہ' خوارج اور کثیر معتزلہ نے بھی کہا ہے کہ اسلامی حکومت قائم کرنا واجب اور فرض ہے۔ اس موضوع پر آیاتِ قرآنیہ اور احادیث اور دیگر فقہا کے فتاویٰ اختصار کی خاطر چھوڑ دیے ہیں۔

انتخاب میں حصہ لینے کے مخالفین

جو لوگ پاکستان میں انتخاب کے مخالف ہیں' ان پر اس حکمِ شرعی کی مخالفت لازم آتی ہے۔ وہ مختلف شبہات کا شکار ہو کر اس حکم شرعی کی پورے زور و شور سے مخالفت کر رہے ہیں' انھیں احساس نہیں کہ وہ ایک ایسے اسلامی حکم کا انکار کر رہے ہیں جو فرض ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنے دور میں غیر منصوص احکام میں صحابہ کرامؓ سے مشاورتیں کیں۔ غزوۂ بدر' اُحد' احزاب' شورائے حدیبیہ اور باجماعت نماز کے بلاوے کے لیے مشاورتیں کیں۔ (بخاری' مسلم' ترمذی)

موجودہ اسمبلیاں مشاورتی مجالس ہیں اور شریعت کے منشا کے مطابق ہیں۔ قراردادِ مقاصد' آئین پاکستان کی رو سے' اسلامی اسمبلیاں ہیں لیکن جن لوگوں کے پاس حکومت کی باگ ڈور ہے' وہ آئین کی خلاف ورزی کرتے ہوئے انھیں غیر اسلامی طریقوں پر چلاتے ہیں۔ قرآن وسنت کے منصوص احکام کے خلاف بل پیش کرتے ہیں۔ قرآن وسنت کے منصوص احکام کو بالادست قانون کا

درجہ نہیں دیتے، قرارداد مقاصد نے ان پر جو پابندی عائد کی ہے کہ وہ قرآن وسنت کی حدود میں رہ کر قانون سازی کریں گے، اسے نظرانداز کرتے ہیں۔ ان لوگوں کو لگام دینے کے لیے شیخ القرآن مولانا گوہر رحمٰن نے ۱۹۸۵ء میں ایک شریعت ایکٹ تیار کیا تھا جس کی تائید ملک بھر کے تمام مفتیانِ کرام نے کی۔ اس کی حمایت میں متفقہ فتویٰ جاری کیا۔ جماعت اسلامی نے اس شریعت بل پر دینی جماعتوں کو جمع کر کے، ایک متحدہ شریعت محاذ بنایا۔ اس بل کو سینیٹ میں مولانا سمیع الحق اور قاضی عبداللطیف نے اور قومی اسمبلی میں شیخ القرآن مولانا گوہر رحمٰن نے پیش کیا لیکن جنرل ضیاء الحق، بے نظیر اور نواز شریف حکومت نے اسے منظور نہ کیا۔ جنرل ضیاء الحق کے دور میں سینیٹ میں ایک شریعت بل پاس ہوا جو اس مقصد کو پورا نہیں کر رہا تھا، اور نواز شریف نے، جو 'شریعت بل' کو پاس کرنے کا انتخابی وعدے کر کے آئے تھے، اُس بل کو سبوتاژ کر دیا اور ایک ایسا بل پاس کیا جسے جماعت اسلامی کی شوریٰ نے شریعت سے فرار کا بل قرار دیا۔

قرارداد مقاصد سے پہلے اور بعد کی اسمبلیوں کا فرق

قرارداد مقاصد کی منظوری دینی سیاست کا اہم موڑ ہے۔ قیام پاکستان سے پہلے مفکر اسلام مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے اس وقت کی اسمبلیوں اور عدالتوں میں مقدمات لے کر جانے کی پالیسی کی مخالفت کی تھی۔ عدالتوں کو طاغوتی عدالتیں قرار دیا تھا۔ قیامِ پاکستان کے بعد اس صورت حال سے نکلنے کے لیے مولانا نے چار نکاتی مطالبہ نظامِ اسلامی کی تحریک شروع کی جس کے مرکزی مطالبات کو قرارداد مقاصد کی شکل میں ۱۲ مارچ ۱۹۴۹ء کو منظور کرلیا گیا۔ یہ قرارداد قیامِ پاکستان کے مقاصد کو واضح کرتی ہے۔ اس قرارداد کو منظور کروانے میں مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے بڑا کلیدی کردار ادا کیا، اور اس کے منظور ہونے کے بعد مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے پاکستان کے اسلامی ریاست بن جانے کا اعلان کیا، اور اسمبلیوں میں عدمِ شرکت اور عدالتوں میں پیش نہ ہونے کی سابقہ پالیسی کو تبدیل کر دیا، اور اُمت کو دعوت دی کہ صالح قیادت کو منتخب کر کے قانون کی زبان میں اسلامی ریاست بن جانے والے ملک کو عملاً ایک حقیقی اسلامی ملک بنانے کی جدوجہد کریں کہ قرارداد مقاصد کے بعد اسلامی نظامِ زندگی کے قیام کی راہیں کھل گئی ہیں۔ مولانا نے فرمایا: جس طرح ایک فرد

کلمہ پڑھنے سے مسلمان ہوجاتا ہے، اسی طرح ریاست بھی کلمہ پڑھنے سے مسلمان ہوجاتی ہے۔ قرارداد مقاصد پارلیمنٹ نے پاس کر کے کلمہ پڑھ لیا ہے اور پارلیمنٹ مسلمان ہوگئی ہے۔ اس لیے اب پاکستان اسلامی ریاست بن گیا ہے۔

قرارداد مقاصد اور آئین کی دیگر اسلامی دفعات

۱- **قرارداد مقاصد:** چونکہ اللہ تبارک و تعالیٰ ہی پوری کائنات کا بلاشرکت غیرے حاکم مطلق ہے اور پاکستان کے جمہور کو جو اختیار و اقتدار اس کی مقرر کردہ حدود کے اندر استعمال کرنے کا حق ہوگا، وہ ایک مقدس امانت ہے۔ چونکہ پاکستان کے جمہور کی منشا ہے کہ ایک ایسا نظام قائم کیا جائے جس میں مملکت اپنے اختیار و اقتدار کو جمہور کے منتخب نمایندوں کے ذریعے استعمال کرے گی جس میں جمہوریت، آزادی، مساوات، رواداری اور عدل عمرانی کے اصولوں پر جس طرح اسلام نے ان کی تشریح کی ہے، پوری طرح عمل کیا جائے گا۔ جس میں مسلمانوں کو انفرادی اور اجتماعی حلقہ ہاے عمل میں اس قابل بنایا جائے گا کہ وہ اپنی زندگی کو اسلامی تعلیمات و مقتضیات کے مطابق جس طرح قرآن وسنت میں ان کا تعیّن کیا گیا ہے، ترتیب دے سکیں۔ جس میں قرارواقعی انتظام کیا جائے گا کہ اقلیتیں آزادی سے اپنے مذاہب پر عقیدہ رکھ سکیں اور ان پر عمل کرسکیں اور اپنی ثقافتوں کو ترقی دے سکیں۔ (ملاحظہ ہو: آئین پاکستان، تمہید نمبر۱، ضمیمہ دفعہ۲، الف، ص۱۸۳۔ ترمیم شدہ ۲۵ مارچ ۱۹۸۷ء)

اس قرارداد مقاصد میں جمہور کو اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ حدود کا پابند کیا گیا ہے۔ اس آئین کی رو سے پاکستان میں مغربی جمہوریت نہیں، بلکہ اسلامی جمہوریت ہے۔ مزید یہ وضاحت بھی کردی گئی ہے کہ جمہوریت کی وہ تشریح معتبر ہوگی جو اسلام نے کی۔ ''جس طرح اسلام نے اس کی تشریح کی ہے''، ''مسلمانوں کو اس قابل بنایا جائے گا کہ وہ اپنی زندگیوں کو اسلامی تعلیمات و مقتضیات کے مطابق جس طرح قرآن وسنت میں ان کا تعیّن کیا گیا، ترتیب دے سکیں''، اس میں بھی اسلامی تعلیمات کی تشریح کے ضمن میں قرآن وسنت کی قید لگادی گئی ہے۔ ان وضاحتوں کے بعد کوئی شخص پاکستان اسمبلی کو طاغوت کہے اور اسے مغربی جمہوریت اور اسلامی جمہوریت میں فرق دکھائی نہ دے

تو یہ اندھا پن ہوسکتا ہے۔ پھر ملک بھر کے تمام مفتیان کرام، علماے عظام اور مفکر اسلام مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے قرارداد مقاصد کی منظوری کے بعد پاکستان کو اسلامی ریاست قرار دیا اور اسمبلیوں میں حصہ لینے کو جائز قرار دیا۔ اب علما اور مفتیانِ کرام کی بات معتبر ہوگی، یا چند نامعلوم لوگوں کی جن کے پاس دین کا واجبی علم بھی نہیں۔

دیگر دفعات

دفعہ ۱- (ا) مملکت پاکستان ایک وفاقی جمہوریہ ہوگی جس کا نام اسلامی جمہوریہ ہوگا۔

دفعہ ۲- اسلام پاکستان کا سرکاری مذہب ہوگا۔

حصہ نہم

اسلامی احکام- ۲۲۷ (ا) تمام موجودہ قوانین کو قرآن وسنت میں منضبط اسلامی احکام کے مطابق بنایا جائے گا جن کا اس حصے میں بطور اسلامی احکام حوالہ دیا گیا ہے اور ایسا کوئی قانون وضع نہیں کیا جائے گا جو مذکورہ احکام کے منافی ہو۔

۲۲۷- (۴) اسلامی کونسل اپنے تقرر سے سات سال کے اندر اپنی حتمی رپورٹ پیش کرے گی اور سالانہ عبوری رپورٹ پیش کیا کرے گی۔ یہ رپورٹ، خواہ عبوری ہو یا حتمی، وصولی سے چھے ماہ کے اندر دونوں ایوانوں اور ہر صوبائی اسمبلی کے سامنے برائے بحث پیش کی جائے گی۔ مجلسِ شوریٰ (پارلیمنٹ) اور اسمبلی رپورٹ پر غور وخوض کرنے کے بعد حتمی رپورٹ کے بعد دوسال کی مدت کے اندر اس کی نسبت قوانین وضع کرے گی۔

باب ۲- مجلس شوریٰ پارلیمنٹ کے ارکان کے بابت احکام۔

مجلس شوریٰ کی رکنیت کے لیے اہلیت

دفعہ ۶۲- کوئی شخص مجلس شوریٰ (پارلیمنٹ) کا رکن منتخب ہونے یا چُنے جانے کا اہل نہیں ہوگا اگر:

د- وہ اچھے کردار کا حامل نہ ہو اور عام طور پر احکام اسلام سے انحراف میں مشہور ہو۔

ہ- وہ اسلامی تعلیمات کا خاطر خواہ علم نہ رکھتا ہو اور اسلام کے مقرر کردہ فرائض کا پابند،

نیز کبیرہ گناہوں سے مجتنب نہ ہو۔

ر- وہ سمجھ دار' پارسا نہ ہو اور فاسق ہو اور امین نہ ہو۔

ز- کسی اخلاقی پستی میں ملوث ہونے' یا جھوٹی گواہی دینے کے جرم میں سزا یافتہ ہو۔

ح- اس نے قیام پاکستان کے بعد ملک کی سالمیت کے خلاف کام کیا ہو' یا نظریۂ پاکستان کی مخالفت کی ہو۔ (ص ۳۶-۳۷)

عہدوں کے حلف - صدر کا حلف

میں صدق دل سے حلف اٹھاتا ہوں کہ میں مسلمان ہوں اور وحدت و توحید' قادر مطلق اللہ تبارک وتعالیٰ' کتب الٰہیہ جس میں قرآن ختم الکتب ہے' نبوت حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم بحیثیت خاتم النبیین جن کے بعد کوئی نبی نہیں ہوسکتا' روزِ قیامت اور قرآن پاک وسنت کی جملہ مقتضیات وتعلیمات پر ایمان رکھتا ہوں.........

......میں اسلامی نظریے کو برقرار رکھنے کے لیے کوشاں رہوں گا جو قیامِ پاکستان کی بنیاد ہے۔

کہ میں اسلامی جمہوریہ پاکستان کے دستور کو برقرار رکھوں گا اور اس کا تحفظ ودفاع کروں گا۔ (اللہ تعالیٰ میری مدد ورہنمائی فرمائے) آمین۔

یہی حلف وزیراعظم کا بھی ہے۔

وفاقی وزرا کا بھی یہی حلف ہے۔ اس میں بھی اسلامی نظریے کو برقرار رکھنے اور دستور کو برقرار رکھنے کا حلف ہے۔ قومی اسمبلی اور سینیٹ کے رکن' گورنر' وزیراعلیٰ اور صوبائی وزرا کے حلفوں میں بھی مذکورہ دونوں شقیں شامل ہیں۔

غرض یہ کہ ہر عہدے دار پر اسلامی نظریہ اور دستور پاکستان کو برقرار رکھنے کی ذمہ داری عائد کی گئی ہے۔

اب تک کا کام

ایسی صورت میں جو کام ہمارے اکابر کر چکے ہیں' وہ انتہائی قابلِ قدر اور خراجِ تحسین کا مستحق ہے۔ قرارداد مقاصد سے لے کر مذکورہ تمام اسلامی دفعات جو ہمارا قیمتی اثاثہ ہے' دینی قوتوں

ہی کی مرہونِ منت ہے۔ یہ کامیابی آسانی سے نہیں ملی۔ اس کے لیے طویل جدوجہد کی گئی ہے۔ قیامِ پاکستان کے متصل، مفکرِ اسلام مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے چار نکاتی مطالبہ نظامِ اسلامی کا آغاز کیا، اور پھر علما اور عوام کے تعاون سے قرارداد مقاصد کی شکل میں اس مہم کو سر کرلیا۔ خصوصاً ۱۹۷۳ء کا دستور جو ایک ایسے شخص کے دور میں منظور ہوا جو روٹی، کپڑا، مکان اور سوشلزم ہماری معیشت، کے نام پر طوفان بن کر اُبھرا تھا۔ اس دور میں دینی جماعتیں پارلیمنٹ میں محدود نشستوں کے باوجود ایک ایسے شخص سے اسلامی دفعات خصوصاً قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دلوانے میں کامیاب ہوگئیں جو بالکل ایک دوسرے ہی طرزِ حکمرانی اور آدابِ زندگی کا خوگر تھا۔

مزید کام

اس اسمبلی کو خالص اسلامی اسمبلی کے طرز پر چلانے کا کام ابھی باقی ہے۔ ان شاء اللہ اسے بھی حاصل کرلیا جائے گا۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ایسے لوگوں کو ممبر منتخب کیا جائے جو اسمبلی کو اسلامی اسمبلی کے طور پر چلانا چاہتے ہوں۔ ایسے ارکان جو دفعہ ۶۲-۶۳ کے معیار پر پورا اُترتے ہوں منتخب ہوجائیں تو اسمبلی کے قانون سازی کے دائرہ کار اور طریق کار میں بھی تبدیلی ہوجائے گی۔

اسمبلی میں عقیدے کی نہیں عملی خرابی

اس وقت اسمبلی میں جو خرابی ہے، وہ عقیدے کی نہیں عمل کی ہے۔ اسمبلی اگر قرارداد مقاصد اور اسلامی دفعات کے مطابق عمل کرے تو یہ اسمبلی، اسلامی اسمبلی ہوسکتی ہے کیونکہ آئین پاکستان حصہ نہم میں اس بات کی تصریح کی گئی ہے کہ تمام موجودہ قوانین کو قرآن وسنت میں منضبط اسلامی احکام کے مطابق بنایا جائے گا، اور کوئی ایسا قانون وضع نہیں کیا جائے گا جو اسلامی احکام کے منافی ہو۔ (دیکھیے: آئین کا حصہ نہم، اسلامی احکام)

حکومتیں مجرم ہیں

اگر حکومت اور پارلیمانی اکثریت کی حامل پارٹی آئین پر عمل کرتی تو اب تک اسلامی نظریاتی کونسل نے جو عبوری اور حتمی رپورٹیں پیش کی ہیں، ان کو اسمبلی میں زیر بحث لاتی جس کا بار بار مطالبہ کیا گیا ہے۔ اسلامی نظریاتی کونسل نے تمام موجودہ قوانین کا جائزہ لے کر اس کی رپورٹ پیش

کردی ہے۔ جائزے کے مطابق تمام قوانین کو اسلامی بنادیا گیا ہے۔ اگر اسلامی نظریاتی کونسل کی رپورٹوں کو قانونی شکل دی جاتی تو معاشرہ معاشرتی، معاشی، سیاسی اور تعلیمی لحاظ سے تبدیل ہوجاتا اور مثالی اسلامی معاشرہ وجود میں آجاتا۔

مجوزہ اقدامات

ہمارے اکابر نے قیامِ پاکستان کے بعد مطالبہ نظام اسلامی کی تحریک چلا کر ریاست اور اسمبلی کو اسلامی بنایا۔ اسلامی دفعات کے ذریعے سوشلسٹ اور سیکولر طبقے کو شکست دی۔ طویل جدوجہد اور دعوت و تعلیم کے ذریعے اس مشن میں کامیابی حاصل کی۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ پارلیمنٹ میں ایسے لوگوں کی اکثریت ہو جو اسمبلی کو اسلامی اسمبلی کے طرز پر چلائیں۔ اس عمل کو مزید مؤثر بنانے کے لیے چند اقدامات ضروری معلوم ہوتے ہیں جن کی نشان دہی مفید ہوگی۔

۱- ایک آئینی ترمیم کے ذریعے قرآن وسنت کو سپریم لا بنا دیں جس میں یہ بات شامل ہو کہ ایسی آئینی شق، قانون، صدارتی، وزارتی اور عدالتی آرڈر از خود کالعدم ہوجائے گا جو قرآن وسنت کے منافی ہو، اور قرآن وسنت کے منافی ہونے کی بنیاد پر کسی بھی آئینی شق اور قانون کو عدالت میں چیلنج کیا جاسکے گا۔

۲- قانون سازی کا دائرہ غیر منصوص اور اجتہادی اور اختلافی مسائل تک محدود کردیا جائے۔

۳- اسلام کے ہر مخلص گروہ اور فرد کا فریضہ ہے کہ وہ مذکورہ دو مقاصد کے حصول کو اپنا نصب العین بنائے اور اس کے لیے عوام کی ذہن سازی میں مصروف ہوجائے۔ گلی گلی، محلے محلے، قریہ قریہ، شہر شہر تبلیغی وفود اور بینرز اور اسٹکرز اور ہینڈ بلز اور زبانی تبلیغ کے ذریعے لوگوں کو اس بات کے لیے تیار کریں کہ وہ نیک لوگوں اور دینی جماعتوں کو بھاری اکثریت سے منتخب کریں تاکہ اسمبلیوں کو مکمل اسلامی بنانے کا مقصد حاصل کیا جاسکے۔

آئینہ بنیے، آئینہ دیکھیے

آئینہ ہم روز دیکھتے ہیں، اس لیے کہ ہم کو اس میں اپنی تصویر نظر آتی ہے۔ ہم اپنی تصویر دیکھ کر ہی اپنے بارے میں صحیح اندازہ لگا سکتے ہیں۔

آئینے کی بڑی خصوصیات ہیں ــــ ان کو ذرا آئینے میں دیکھیے!

- آپ کی تصویر بلا کم و کاست بتائے گا۔ افراط و تفریط سے اجتناب کرے گا
- آپ کو سامنے آتے ہی فوراً بتائے گا۔ دیر نہیں لگائے گا۔
- آپ سے کوئی اُجرت نہیں طلب کرے گا۔ آپ کا مخلص رہے گا۔
- آپ کی تصویر کسی اور کو نہیں دکھائے گا۔ کسی اور کی تصویر آپ کو نہیں دکھائے گا۔ غیبت نہیں کرے گا۔
- ہر بار آپ کو اس وقت کی تصویر دکھائے گا۔ پہلے کی تصویر کی اچھائی یا برائی کو یاد نہیں رکھے گا۔ پرانی بات کو بھول جاتا ہے۔
- جب تک آپ سامنے ہیں تصویر دکھائے گا۔ آپ کے ہٹتے ہی آپ کی تصویر مٹا دے گا۔
- جو سامنے نظر آ رہا ہے اس پر فیصلہ کرے گا، کھوج اور جستجو میں نہیں پڑے گا۔
- آپ کی بے عزتی نہیں کرے گا۔ آپ کو اصلاح پر آمادہ کرے گا۔
- آپ آئینے پر اعتبار کر سکتے ہیں۔
- ایک دفعہ دیکھ کر دوبارہ دیکھنے کے لیے پلٹتے ہیں۔

عجب نہیں کہ آئینے کی ان اور دوسری خوبیوں ہی کے پیشِ نظر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ مومن، مومن کا آئینہ ہوتا ہے۔

آئینے کے تصور پر ہم اپنی اجتماعی زندگی کی بنیاد رکھ سکتے ہیں۔ یہ ایک طرز معاشرت ہے، اسلوبِ تعلقات ہے، ثقافت ہے، نظام ہے۔

سنابل العلم

انسانی وسائل کی ترقی ـــــ اسلامی نقطۂ نظر

ارشد احمد بیگ ○

انسانی وسائل کی ترقی (Human Resource Development) آج کی ایک معروف اصطلاح ہے۔ بزنس ایڈمنسٹریشن کی تعلیم میں تو یہ موضوع ان کے مضامین کا لازمی حصہ ہوتا ہے۔ اسی طرح کارپوریٹ سیکٹر ہو یا مشنری ادارے' یہ کام وہاں باقاعدہ اور منظم انداز میں ہوتا ہے۔ ادارے کے وژن کو حاصل کرنے کے لیے انسانی وسائل کو ایک خاص ڈھب میں ڈھالنا اور ترقی دینا اب مستقل نوعیت کا فن بن چکا ہے۔ بڑے اداروں میں اس کے شعبہ جات قائم کیے جاتے ہیں۔ کسی بھی متعین مقصد اور ہدف کو حاصل کرنے کے لیے قائم کوئی منظم یا تحریک اپنے کارکنوں اور قائدین کے لیے تربیتی نظام عنوان سے دراصل ایچ آر ڈی کا کام ہی کرتی ہے۔

ہیومن ریسورس ڈویلپمنٹ (HRD) کی تعریف و تشریح معاشرے کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے ماہرین' مثال کے طور پر ماہرین معاشیات' ماہرین تعلیم' ماہرین نفسیات' صنعت کار' منتظمین وغیرہ اپنے اپنے انداز اور پیرایے میں کرتے ہیں۔ انسانی وسائل کی ایک تعریف یہ کی جاتی ہے:

> انسانی وسائل سے مراد کسی تنظیم کے مالی و مادی وسائل کے بالمقابل وہ افراد ہیں جو اس تنظیم کو چلاتے ہیں۔ اس سے مراد تنظیم کی کارکردگی ہے جو افراد اور وسائل سے متعلق ہے جیسے جائزہ' تربیت' معاوضے' بھرتی وغیرہ۔ انسانی وسیلہ تنظیم کا واحد فرد یا ملازم ہے۔

○ پروگرام مینیجر، پاکستان انسٹی ٹیوٹ آف ہیومن ڈویلپمنٹ' کراچی

ہیومن ریسورس ڈویلپمنٹ کی تعریف یہ کی جاتی ہے:

انسانی وسائل کی ترقی ملازموں کو ان کی ذاتی اور تنظیمی صلاحیتوں' قابلیتوں' مہارتوں اور معلومات کی ترقی میں مدد دینے کا نظام ہے۔ یہ ملازمین کی تربیت' جانشینوں کے لیے منصوبہ بندی' کلیدی ملازم کی نشان دہی' تعلیم میں مدد وغیرہ کا احاطہ کرتا ہے۔

ایچ آر ڈی کا بنیادی ہدف درج ذیل سطور سے معلوم کیا جاسکتا ہے۔ انسانی وسائل کی ترقی کا مرکزی نکتہ' اعلیٰ درجے کے کارکن تیار کرنا ہے تاکہ تنظیم اور ملازمین گاہکوں کی خدمت کے حوالے سے اپنے کام کے مقاصد کو حاصل کریں۔

جہاں تک ہیومن ڈویلپمنٹ کا موضوع ہے' اس ضمن میں اقوام متحدہ کا جاری کردہ ہیومن ڈویلپمنٹ انڈکس ایک مستند درجہ رکھتا ہے۔ اس میں تعلیم، معیارِ زندگی، اوسط عمر اور صحت مند زندگی وغیرہ شامل ہیں۔ کئی ادارے ہیومن ڈویلپمنٹ کے عنوان کے تحت ناخواندگی ختم کرنے میں مصروف ہیں اور کچھ آگہی وشعور بیدار کرنے میں۔

اسی طرح ہیومن ریسورس منیجر یا اس شعبے سے متعلق جو ذمہ داریاں اور کام مطلوب ہیں ان میں افراد کی بھرتی، کارکردگی، ترغیب وآمادگی، تعلیم وتربیت، مسائل، صلاحیت کی نشوونما وغیرہ بھی اِس میں شامل ہیں۔

ان تعریفوں سے جو نمایاں نکات سامنے آتے ہیں وہ درج ذیل ہیں: ○ افرادِ کار کی ذاتی نشوونما ○ افرادِ کار کی تربیت ○ افرادِ کار کے مستقبل کی منصوبہ بندی ○ استعداد میں اضافہ ○ اداروں کی ترقی

ان تمام اہداف کا مقصد صرف اور صرف یہ ہے کہ فرد اپنی ذات کی نشوونما اس لیے اور اس طرح کرے کہ اس سے اداروں کے لیے مطلوبہ اہداف کا حصول ممکن ہوسکے۔ ان اہداف کا تعلق، مفادِ عامہ سے ہو بھی سکتا ہے اور نہیں بھی۔ جیسے جیسے مادیّت کے رجحانات بڑھ رہے ہیں اور مسابقت کی فضا میں اضافہ ہو رہا ہے، ویسے ویسے مال ودولت کے حصول میں اخلاقیات کا عنصر کم ہوتا جارہا ہے۔ لہٰذا اس تناظر میں ہیومن ریسورس ڈویلپمنٹ کی تعلیم وتربیت کے لیے جو اسکیم وضع کی جاتی ہے' اس میں اصل ہدف ایک ایسے فرد کی تیاری ہے جو ادارے کے لیے اس طرح سودمند

ثابت ہو کہ اس کے کاروباری پھیلاؤ کا ذریعہ بنے۔ چنانچہ ہیومن ریسورس ڈویلپمنٹ کا اصل مدعا منافع کی زیادہ سے زیادہ تکثیر (maximization of profit) ہی بن کر رہ جاتا ہے۔ اطلاعاتی ٹکنالوجی کے اس دور میں، مارکیٹنگ باقاعدہ ایک سائنس کا درجہ اختیار کر چکی ہے۔ اور اخلاقی اقدار سے عاری (بالعموم) یہ سائنس، کاروباری پھیلاؤ اور مالی منفعت کے لیے ہر قسم کے تشہیری حربے استعمال کرتی ہے۔ ان تشہیری مہمات سے طلب کی ایک نفسیاتی اور مصنوعی فضا پیدا ہوتی ہے جس سے عام آدمی متاثر ہو کر رہتا ہے۔ اسی طرح ہیومن ریسورس ڈویلپمنٹ کے تربیتی نصاب میں یا فرد کی کارکردگی کا جائزہ لینے کے عمل میں اگر فرد کی صرف ان کوششوں کو قابل قدر سمجھا جائے جو ادارے کے لیے مالی منفعت کا باعث بنتی ہو، تو یہ اگرچہ موجودہ کاروباری فلسفے کے تناظر میں بالکل درست ہوگا، لیکن ہمارے نقطۂ نظر سے یہ رویہ نادرست اور بعید از انصاف ہوگا۔

ایک اہم نکتہ

ہم سمجھتے ہیں کہ تیزی سے پھیلتی ہوئی ایچ آر ڈی کی یہ اصطلاح اپنے اندر ایک خاص معنی رکھتی ہے۔ اصطلاحات میں الفاظ کے چناؤ کی بھی اپنی نفسیات ہوتی ہے۔ جب ہم انسانی وسائل کی ترقی کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں، تو دراصل ہم 'انسان' کو ایک وسیلہ یا ذریعہ (resource) سمجھتے ہیں، جس کی نشوونما خاص مقاصد کے حصول کے لیے کی جائے گی۔ گویا اصل چیز وہ مقاصد ہیں جن کے لیے 'انسان' کو بروے کار لانا ہے۔ بظاہر اس نظریے میں کوئی قباحت نظر نہیں آتی لیکن جب یہ اصطلاح کاروباری دنیا میں استعمال ہوتی ہے تو اس کے نتائج بہت خطرناک ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ یہاں پر انسان کی شناخت بحیثیت 'انسان' (اور وہ بھی اشرف المخلوقات) نہیں ہوتی بلکہ کاروباری مقاصد کے حصول میں مددگار محض ایک ذریعے اور وسیلے (resource and means) کے ہوتی ہے۔

ہمارا موقف یہ ہے کہ اگر یہ اصطلاح استعمال کی جارہی ہے تو انسان کے اشرف مقام کو مدِنظر رکھ کر نشوونما، ترقی اور بڑھوتری عمل میں لائی جائے۔ گویا کہ اگر یہ وسیلہ ہے تو لازمی طور پر اس کا مقصد اس وسیلے سے زیادہ اشرف، افضل اور برتر ہونا چاہیے۔

اس مضمون میں ہم ہیومن ریسورس اور ہیومن ریسورس ڈویلپمنٹ کو ایک مختلف حیثیت میں بیان کریں گے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ایک شخص بحیثیت انسان جو کسی بھی مقام پر اور کسی بھی شعبے میں کام کر رہا ہے، اس کی نشوونما، ترقی اور بڑھوتری کے اصول ایک جیسے ہوتے ہیں۔ گویا انسانی وسیلے کی تعریف اور وظائف اور کردار کو بحیثیت انسان (ایک مخلوق) سمجھنا بہت ضروری ہے تاکہ انسان کی استعداد اور کمزوریاں، خواہشات اور جذبات اور فطرت اور جبلتیں ہمارے سامنے آجائیں اور انسان کو کسی مقصد کے لیے تیار کرنا، ترقی دینا، نشوونما دینا اور بڑھانا آسان اور ممکن ہو سکے۔ اس طرح وہ زندگی کے کسی بھی شعبے میں کسی بھی جگہ اور کسی بھی حیثیت میں اپنا کردار مؤثر طور پر ادا کر سکے گا۔

آیئے ہیومن ریسورس ڈویلپمنٹ کو ایک دوسرے زاویے سے دیکھتے ہیں۔ یہ زاویہ اسلامی زاویہ ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ جس طرح کسی مشین کو اپ گریڈ کرنا مقصود ہو تو سب سے پہلے اس مشین کے بارے میں مکمل آگاہی حاصل کرنا ضروری ہے لہٰذا انسان کی نشوونما اور ترقی کو سمجھنے کے لیے ہم 'انسان' کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بحیثیت مسلمان ہمارا ایمان ہے کہ:

- انسان اللہ کی تمام مخلوقات میں اشرف اور افضل ترین ہے۔ (لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ - التین ۹۵:۴)
- انسان جسم اور روح کا مرکب ہے۔ (وَنَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ - الحجر ۱۵:۲۹)
- انسان روزِ محشر اللہ کے حضور اپنے تمام اعمال کے لیے جواب دہ ہے۔ (لَا یُسْئَلُ عَمَّا یَفْعَلُ وَ هُمْ یُسْئَلُوْنَ - الانبیاء ۲۱:۲۳)
- انسان کو اختیار اور عمل کی آزادی دی گئی ہے۔ (اِنَّا هَدَیْنٰهُ السَّبِیْلَ اِمَّا شَاکِرًا وَّاِمَّا کَفُوْرًا ○ الدھر ۷۶:۳)
- انسان کو خلافت ارضی سے نوازا گیا ہے گویا وہ یہاں پر اللہ کا خلیفہ (Vicegerent) ہے۔ (اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً - البقرہ ۲:۳۰)
- انسان کو سمع، بصر اور فواد کی نعمتیں اور صلاحیتیں دی گئی ہیں۔ (اِنَّ السَّمْعَ وَ الْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ کُلُّ اُولٰٓئِکَ کَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا - بنی اسرائیل ۱۷:۳۶)

- انسان کو تسخیر کائنات کے لیے امکانی صلاحیت (potential) دی گئی۔ (وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ کُلَّھَا - البقرہ ۲:۳۱)
- انسان کو اس potential کے درست استعمال کے لیے الہامی ہدایت دی گئی ہے۔ (فَاِمَّا یَاْتِیَنَّکُمْ مِّنِّیْ ھُدًی - البقرہ ۲:۳۸)

مندرجہ بالا تمام حقائق کا حاصل یہ ہے کہ انسان کی نشوونما، بڑھوتری اور ترقی کے لیے درج ذیل عوامل کو مدنظر رکھنا لازمی ہوگا۔

۱- انسان کی جسمانی احتیاجات

۲- انسان کی روحانی آسودگی

۳- انسان کی نشوونما ان تمام زاویوں سے کہ وہ اپنے مفوّضہ امور کو احسن طریقے سے انجام دے سکے۔

۴- ہیومن ریسورس ڈویلپمنٹ کے لیے الہامی ہدایت کی روشنی میں اپنی عقلِ سلیم اور تجربے سے راہوں کو متعین کر سکے۔

شخصیت کا ارتقا

دین اسلام نے ترقی ونشوونما کے لیے اور فرد ومعاشرے کی فلاح وکامیابی کے لیے انسان کی شخصیت میں ایک توازن قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔ جسمانی احتیاجات کی تسکین اور مادی حوالوں سے اٹھان کے ساتھ ساتھ وہ روحانی ارتقا کی طرف بھی رہنمائی کرتا ہے۔ اسی طرح اسلام بنیادی انسانی اخلاقیات، جن کے بغیر شاید دنیاوی ترقی ممکن نہیں ہے، کو درجۂ کمال تک دیکھنا چاہتا ہے۔ ساتھ ہی وہ ایمانیات وعقائد کی درستی کو بھی ناگزیر قرار دیتا ہے۔ انسان میں دونوں صلاحیتیں بھی ودیعت کی گئی ہیں، یعنی مثبت اور منفی جو آزادی اور انتخاب کے لیے ضروری ہیں۔ فَاَلْھَمَھَا فُجُوْرَھَا وَتَقْوٰھَا o (الشمس ۹۱:۸) ''پھر اس کی بدی اور اس کی پرہیزگاری اس پر الہام کر دی''۔ لہٰذا ہیومن ریسورس ڈویلپمنٹ میں فرد کی تیاری، شخصیت سازی اور کردار کی اٹھان میں یہ عوامل بھی مدنظر رکھنا ضروری ہیں۔

اس مقام پر ہم قرآن مجید میں لفظ 'انسان' (ہیومن) کا مطالعہ بھی پیش کرتے ہیں۔ قرآن مجید

میں لفظ ’انسان‘ ۶۴ مرتبہ آیا ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ ان مقامات میں تواتر کے ساتھ جو مضامین انسان کے حوالے سے ملتے ہیں‘ ان میں انسان کی منفی کیفیات کو بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً یہ کہ انسان:

○ بڑا ہی ناشکرا ہے۔ ○ سخت مایوس ہو جاتا ہے۔ ○ فخر کرتا ہے۔ ○ بے انصافی کرتا ہے۔ ○ جلد باز ہے۔ ○ نعمت پا کر اینٹھنے والا ہے۔ ○ مصیبت میں مایوس ہونے والا ہے۔ ○ جھگڑالو ہے۔ ○ منکرحق ہے۔ ○ ظالم ہے۔ ○ جاہل ہے۔ ○ دل شکستہ ہوجاتا ہے۔ ○ نعمت پا کر منہ پھیر لیتا ہے۔ ○ آفت میں لمبی چوڑی دعائیں کرتا ہے۔ ○ کھلا احسان فراموش ہے۔ ○ تھڑدلا ہے۔ ○ خوش حالی میں بخل کرتا ہے۔ ○ مصیبت میں گھبراہٹ کا شکار ہوتا ہے۔☆

گویا انسانی شخصیت کے ارتقا کی جب بھی کوئی اسکیم وضع کی جائے گی‘ درج بالا منفی رجحانات کو قابو میں رکھنے کے لیے سرگرمیاں اور فعالیتیں متعین کی جائیں گی۔ چونکہ انسان مخلوق ہے اور اس کا خالق اللہ ہے‘ لہٰذا شخصیت سازی کے لیے وہی (خالق) سب سے بہتر طریقے کی طرف رہنمائی کرسکتا ہے۔ انسانی وسائل کی ترقی کا کوئی بھی نصاب جو ان منفی رجحانات کو بڑھانے کا باعث ہو، ہیومن ریسورس ڈویلپمنٹ سے اس کا واسطہ نہیں ہوسکتا اور نہ وہ معاشرے میں خوشگوار اثرات مرتب کرسکتا ہے۔ قابل غور نکتہ یہ ہے کہ دنیا میں ہیومن ریسورس ڈویلپمنٹ کا وضع کردہ خاکہ یک چشمی ہے اور شخصیت کے تمام پہلوؤں کا احاطہ نہیں کرتا۔ اسی طرح ہیومن ڈویلپمنٹ میں انسانی ترقی کا جو اشاریہ ترتیب دیا گیا ہے‘ ان کے مطابق وہ ممالک جو اس حوالے سے سرفہرست ہیں، مقام حیرت ہے کہ وہاں خودکشی کی شرح بھی بہت زیادہ ہے۔ OCED ممالک، جو ترقی یافتہ کہلاتے ہیں، میں بھی یہ شرح روز بروز بڑھ رہی ہے۔ یہاں بے سکونی کا یہ عالم ہے کہ ماہرین نفسیات کی پریکٹس انتہائی کامیاب اور نہایت مہنگی ہے۔

☆ [حوالہ جات : القرآن الکریم (سورۃ/آیت) ۲۸:۴، ۱۲:۱۰، ۹:۱۱، ۵:۱۲، ۳۴:۱۴، ۲۶:۱۵، ۱۱:۱۷، ۱۳:۱۷، ۵۳:۱۷، ۶۷:۱۷، ۸۳:۱۷، ۵۴:۱۸، ۶۶:۱۹، ۶۷:۱۹، ۳۷:۲۱، ۶۶:۲۲، ۱۲:۲۳، ۲۹:۲۵، ۸:۲۹، ۱۴:۳۱، ۷:۳۲، ۷۲:۳۳، ۷۷:۳۶، ۸:۳۹، ۴۹:۳۹، ۴۹:۴۱، ۵۱:۴۱، ۴۸:۴۲، ۱۵:۴۳، ۱۵:۴۶، ۱۶:۵۰، ۲۴:۵۳، ۳۹:۵۳، ۳:۵۵، ۱۴:۵۵، ۱۶:۵۹، ۱۹:۷۰، ۳:۷۵، ۵:۷۵، ۱۰:۷۵، ۱۳:۷۵، ۱۴:۷۵، ۳۶:۷۵، ۱:۷۶، ۲:۷۶، ۳۵:۷۹، ۱۷:۸۰، ۲۴:۸۰، ۶:۸۲، ۶:۸۴، ۵:۸۶، ۱۵:۸۹، ۲۳:۸۹، ۴:۹۰، ۴:۹۵، ۲:۹۶، ۵:۹۶، ۶:۹۶، ۳:۹۹، ۶:۱۰۰، ۲:۱۰۳]

تزکیہ کا ایک پہلو

ہیومن ریسورس ڈویلپمنٹ کو سمجھنے کے لیے قرآن مجید کی درج ذیل آیات کا مطالعہ ضروری محسوس ہوتا ہے۔ ان آیات میں رب العالمین نے نبی کریمؐ کا مقصدِ بعثت ارشاد فرمایا ہے۔ قرآن حکیم میں یہ مضمون چار مقامات پر آیا ہے:

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ ط اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُالْحَكِيْمُ ٥ (البقرہ ۲:۱۲۹) اے رب! ان لوگوں میں خود انھیں کی قوم سے ایک رسول اٹھائیو، جو انھیں تیری آیات سنائے ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور ان کی زندگیاں سنوارے، تو بڑا مقتدر اور حکیم ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ قرآن مجید نے کامیابی کے اصل معیار اور میزان کی طرف بھی توجہ دلائی ہے جو ہمیشہ پیشِ نظر رہنا چاہیے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا ٥ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا ٥ (الشمس ۹۱:۹-۱۰) یقیناً فلاح پا گیا وہ جس نے نفس کا تزکیہ کیا اور نامراد ہوا وہ جس نے اس کو دبا دیا۔

ہم سمجھتے ہیں کہ ہیومن ریسورس ڈویلپمنٹ کا اصل کام اور اس کی درست ترتیب یہی ہے۔ تلاوتِ آیات اور تعلیمِ کتاب وحکمت کا مدعا بھی یہی تزکیہ ہے۔ اس مضمون میں ہم صرف تزکیے کی بات کرتے ہیں۔ انسان کی نشوونما دراصل تزکیہ ہی ہے۔ تزکیے کے جو معانی اور مفہوم آئے ہیں وہ یوں ہیں: ○ زندگیوں کو سنوارنا ○ پاک صاف کرنا ○ بلند کرنا ○ غلط افکار وتصورات سے پاک کرنا ○ بے جا خواہشات سے پاک کرنا ○ ظاہری و باطنی نجاست سے پاک کرنا وغیرہ وغیرہ۔

ہم اس کی مثال یوں لیتے ہیں کہ ایک پودا جو ایک مالی کی نگرانی میں بڑھ رہا ہو اور ایک خودرو جھاڑی یا درخت جو جنگل میں اُگ جائے، دونوں کی کیفیات میں فرق ہوگا۔ مالی کی زیرنگرانی بڑھنے والے پودے میں تراش خراش، صفائی ستھرائی اور نکھار ہوگا۔ مطلوبہ چیزیں موجود ہوں گی اور مزید پروان چڑھنے کے لیے چھوڑ دی جائیں گی جب کہ نامطلوب ٹہنیاں، شاخیں، پتے، کانٹے، ڈالیاں وغیرہ کاٹ دی جائیں گی۔ بس یہی تزکیہ ہے کہ انسان کی شخصیت کی تعمیر اس طرح کی جائے

کہ اس سے نامطلوب اوصاف کم ہوتے جائیں اور مطلوب پروان چڑھیں، اخلاق رذیلہ کو ختم کیا جائے اور اخلاق حسنہ کو پروان چڑھایا جائے۔ یہی انسانی وسائل کی ترقی کی اصل روح ہونی چاہیے۔

انسان کے ارتقائی میدان میں اس کی فکر و تصور، نیت و ارادہ، سوچ و تخلیق، حواس خمسہ کے استعمالات، جسم و روح، لباس و پوشاک، علوم و فنون، جسمانی افعال، حفظ و خیال، تعلقات، معاملات، جذبات اور مہارتیں وغیرہ سب ہی کچھ شامل ہیں۔ چنانچہ ہم ان کو درج ذیل مختلف عنوانات کے تحت بیان کریں گے۔

جسمانی پہلو (physical dimension)

انسان کی جسمانی نشو ونما (physical development) ایک ہمہ گیر تصور ہے اور اس کا تعلّق صرف ظاہری خدوخال سے نہیں ہے' بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک فرد کے پاس کسی کام کو احسن انداز میں کرنے کے لیے جسمانی قوت، صلاحیت، توانائی، امنگیں اور نفسیاتی لگن بھی ہو۔ جسمانی نشو ونما میں صحت مند جسم اور ذہن کو فوکس کیا جاتا ہے۔ چنانچہ ہمیں عالمی ادارہ صحت کی پیش کردہ تعریف میں بھی یہ وسعت نظر آتی ہے۔

"Health is a state of complete physical, mental and social well-being and not merely the absence of disease or infirimity".

صحت محض بیماری یا معذوری کے عدم وجود کا نام نہیں ہے' بلکہ یہ ایک مکمل جسمانی، ذہنی اور سماجی اچھی کیفیت کا نام ہے۔

جسمانی ضعف (معذوری کے علاوہ) کو دین اسلام ناپسندیدہ قرار دیتا ہے۔ وہ سخت کوشی، جفاکشی اور محنت کے جذبے کو ابھارتا ہے۔ سستی، کاہلی اور سہل پسندی کو نامطلوب قرار دیتا ہے۔ اللہ کے رسول کریمؐ نے اپنے عہد اور ماحول کے مروجہ جسمانی تفریحی اشغال کی طرف توجہ دلائی، فرمایا: ''تیر اندازی، گھڑ سواری اور تیراکی سیکھو''۔ اسی طرح حضرت عمرؓ کے ارشادات میں گھوڑے پر چھلانگ لگا کر بیٹھنا، ننگی پیٹھ پر سواری، دھوپ کو برداشت کرنا وغیرہ شامل ہیں۔ ایک فرد کی اس انداز میں نشو ونما کہ وہ مطلوبہ کام کو کرنے کی اپنے اندر جسمانی لحاظ سے مکمل اہلیت پائے، انسانی

وسائل کی ترقی کا ایک اہم پہلو ہے۔

اخلاقی پہلو (moral dimension)

اخلاقی نشوونما (moral development) کی تشریح سے قبل یہ بتا دینا ضروری ہے کہ روحانی نشوونما اور اخلاقی نشوونما میں فرق ہے۔ اخلاقی نشوونما کا تصور اچھائی اور برائی کے ان آفاقی اصولوں پر مبنی ہے جس کی تمیز بالعموم ہر انسان کر سکتا ہے۔ مثال کے طور پر سچ بولنا یا جھوٹ بولنا، دھوکہ دہی، ایمان داری، صفائی ستھرائی، قطار بنانا وغیرہ وغیرہ۔ گویا اخلاقی نشوونما میں ان عمومی قواعد وضوابط اور اوامر ونواہی پر توجہ دی جاتی ہے جن کو ایک سلیم الفطرت شخص سمجھتا ہے۔ اخلاقی نشوونما کسی بھی معاشرے میں، خواہ وہ مسلم ہو یا غیر مسلم، بالعموم یکساں ہی ہوگی۔ البتہ دو باتیں ذہن میں رکھنی چاہییں۔

اوّل یہ کہ دین اسلام میں نظامِ اقدار مستقل (permanent) اور مطلق (absolute) ہے، جو زمان ومکان کی حدود و قیود سے بالاتر ہے، جب کہ بعض دوسرے نقطہ ہاے نظر میں یہ ایک اضافی تصور ہے جو زمان ومکان کی تبدیلی کے ساتھ بدل سکتا ہے۔ دوم یہ کہ بعض مروجہ اصطلاحات کی فی زمانہ تشریحات اسلام کے مطابق ناقص اور ادھوری ہیں۔ مثال کے طور پر صفائی ستھرائی۔ اسلام اس حوالے سے اس سے بڑھ کر پاکیزگی کا اعلیٰ تصور پیش کرتا ہے جس میں صفائی ستھرائی طہارت و نظافت وغیرہ سب شامل ہیں۔ اسلام نے اخلاقی نشوونما پر جتنا زور دیا ہے، اس کا اندازہ صرف اس بات پر لگایا جا سکتا ہے کہ نبی کریمؐ نے ارشاد فرمایا کہ ''میں مکارمِ اخلاق کی تکمیل کے لیے بھیجا گیا ہوں'' (انما بعثت لاتمم مکارم الاخلاق)۔ آپؐ نے اوامر ونواہی (Do's & Don'ts) کی پوری تفصیلات سے آگاہ کیا ہے جو کسی بھی فرد، گھر، ادارے، معاشرے، قوم اور ملکوں کی ترقی اور کامیابی کی ضمانت ہے۔ یورپی معاشروں میں جو ادارے ترقی کی راہ پر گامزن ہیں، ان میں یہ اخلاقی صفات من حیث القوم یا اداروں کے اجتماعی اخلاق کے طور پر موجود ہیں۔ چنانچہ اس ضمن میں اخلاقِ حسنہ اور اخلاق رذیلہ کی فہرست مرتب کرنی چاہیے تاکہ ہیومن ریسورس ڈویلپمنٹ میں ان پہلوؤں پر کماحقہ زور دیا جا سکے۔

سماجی پہلو (social dimension)

انسان کے لیے تنہائی میں زندگی گزارنا تقریباً ناممکن ہے۔ وہ معاشرتی گروہ کا ایک حصّہ ہے۔ وہ ایک بڑے کُل کا جزو ہے۔ اس کی انفرادیت ہے لیکن اس کی یہ انفرادیت کسی نظام کا حصّہ ہوتی ہے لہٰذا اس کے مزاج میں جُڑ کر رہنے کا اندرونی اور پیوستہ داعیہ ہوتا ہے۔ باہمی تعلقات، بات چیت، گھلنا ملنا اور لڑنا جھگڑنا یہ سب اس کی طبیعت اور مزاج کا حصّہ ہیں۔ چونکہ وہ کسی جنگل میں نہیں بستا لہٰذا ان سے مفر ممکن نہیں ہے۔ اہمیّت صرف اس بات کی ہے کہ فرد کی سماجی نشوونما کس نہج پر ہوتی ہے اور اس کی ذات میں دوسروں کے لیے کتنی گنجایش ہے، اور وہ دوسروں سے مطابقت کے لیے کس درجہ آمادہ ہے۔ باہمی معاملات میں اس کے مزاج میں بے زاری ہے یا جوش۔ ایک انسان کی سماجی نشوونما درست نہج پر ہو تو وہ ہر قسم کے لوگوں سے مثبت اور متوازن انداز میں معاملات کر سکتا ہے۔ بہت سارے افراد بہت گھلنے ملنے والے ہوتے ہیں اور بہت سارے کم آمیز۔ اہم معاملہ یہ ہے کہ افراد سے تعلقات کی نوعیت کیا ہے۔ گویا صرف زیادہ افراد سے تعلقات ہی اہم نہیں ہیں، بلکہ ان کی کیفیات بھی اہم ہیں۔ یعنی تعلقات کی وسعت اور ان کی بہتر نوعیت دونوں مطلوب ہیں۔

اسلام نے ہر ایک سے اچھے انداز اور حسنِ خلق سے پیش آنے کی تاکید کی ہے۔ گویا گھر میں باضابطہ، ذمہ دارانہ اور نمایاں کردار ادا کرنا، پڑوسیوں کے حقوق ادا کرنا، رشتوں کو جوڑنا، آجروں سے خیرخواہانہ تعلقات، راہ چلتے لوگوں کے حقوق، مریضوں سے رابطے، قرض خواہوں کی فکر، معذوروں کی مدد، چھوٹوں پر شفقت، بزرگوں کا احترام یہ سب ہماری بنیادی تعلیمات ہیں جو سماجی نشوونما کے نصاب کا حصّہ ہونا چاہییں۔

روحانی پہلو (spiritual dimension)

روحانی نشوونما اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ مخلوق کو اپنے خالق کا شعور اور احساس ہو۔ اللہ کی معرفت کا حصول ہی روحانی نشوونما کا اہم مقصد ہے۔ ایک انسان بعض اخلاقی صفات میں اعلیٰ درجے کے کردار کا مظاہرہ کر سکتا ہے لیکن اللہ کی معرفت اور اس کا دھیان نہ ہو تو یہ کردار ناپایدار بھی ہوسکتا ہے اور اگر پایدار بھی ہو تو اس کا فائدہ صرف دنیا میں ہوگا۔ اسی لیے فرد میں ہر لمحہ اللہ کا دھیان

پیدا کرنا ہیومن ریسورس ڈویلپمنٹ کا اہم کام ہے۔

چونکہ انسان، جسم اور روح کا مرکب ہے لہٰذا جسمانی احتیاجات کی تسکین کے ساتھ ہی اسے روحانی بالیدگی کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ روحانی نشوونما انسان کی جبلت میں شامل ہے۔ لہٰذا وہ اس کے لیے نت نئے تجربات کرتا ہے۔ چونکہ وہ خود ساختہ اور انسانی ذہن کی تخلیق ہوتے ہیں لہٰذا غیرانسانی ہی کہلاتے ہیں مثلاً یہ نظریہ کہ اپنے آپ کو تکلیف دہ عمل سے گزار کر روحانی آسودگی حاصل ہوتی ہے' چنانچہ اپنے اُوپر کیڑے مکوڑے، سانپ، بچھو وغیرہ چھوڑ دینا، ایک ٹانگ پر گھنٹوں کھڑے رہنا، پانی کا استعمال ترک کر دینا، صفائی ستھرائی سے اجتناب برتنا' اپنی کھالوں میں آنکڑے لگا کر ہوا میں معلق ہو جانا وغیرہ وغیرہ۔ کچھ اور لوگ بھی ہیں جو غیرمنطقی انداز میں ذہنی قوت کے عنوان سے سکون کی متلاشی ہیں۔ معلوم ہوا کہ یہ وہ اہم معاملہ ہے جس سے انسان کو مفر نہیں ہے۔ چنانچہ صرف وہی طریقہ قابلِ قبول اور انسانی نفسیات کے مطابق ہے جو الہامی ہدایات پر مبنی ہے۔ اس کے علاوہ روحانی نشوونما کے سارے طریقے ادھورے اور ناقص ہیں اور مزید فکری انتشار کا باعث ہیں۔

ذہنی پہلو (intellectual dimension)

فرد کی ایسی ذہنی نشوونما کرنا انتہائی اہم ہے، جس سے اس کے حواس خمسہ کارکردگی کے حوالے سے اپنے درجۂ کمال کو پہنچ جائیں۔ المیہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں ذہنی نشوونما کی جانچ و پیمایش بھی چند مخصوص عنوانات کے تحت ہوتی ہے جن کا تعلّق فرد کے کردار میں مثبت تبدیلی کے واقع ہونے سے بہت کم ہوتا ہے اور دنیاوی منفعت کے حصول سے زیادہ ہوتا ہے۔

یہ بات بھی اپنی جگہ اہم ہے کہ حافظہ (memory)، مفروضات (data)، فکر (thought)، معلومات (information)، تصور (concept)، خیال (idea)، بصیرت (insight) اور حکمت (wisdom) کے معانی، مفہوم اور اہمیّت جدا جدا اور مسلمہ ہیں۔ مگر ان تمام سے جو مطلوب ہے۔ یعنی فرد صالح، وہ ہم تیار نہیں کر پاتے۔ خلافت ارضی کے لیے درکار صالحیت (character) اور صلاحیت (competence) پر ہماری توجہ بالعموم کم رہتی ہے۔ اطلاعاتی ٹکنالوجی کے اس دور میں تو اطلاعات و تصورات کا سیلاب اُمڈا چلا آرہا ہے لیکن تبدیلی کا عمل کیوں نہیں ہو رہا ہے، سوچنے کا

مقام ہے۔ ذہنی نشوونما کے ذریعے وہ بصیرت مطلوب ہے جو تجزیاتی عمل اور منطقی استدلال میں، مشاہداتی عمل اور ذہانت میں حقیقت کو پا سکے۔ جو دُعا ہمیں سکھلائی گئی ہے وہ یوں ہے: اللھم واکشف لی وجوہ الحقائق (اے اللہ میرے سامنے ہر معاملے میں حقائق کے سارے پہلو کھول دے)۔ یہی حکمۃ ہے اور یہی ہیومن ریسورس ڈویلپمنٹ کا جوہر ہے۔ (وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا - البقرہ ۲:۲۶۹)

ابھی ہم نے مختلف پہلوؤں سے انسانی نشوونما وترقی کو سمجھنے کی کوشش کی ۔ یہاں پر مہارات، تصورات اور اقدار کے مثلث کی تشریح وتفہیم بھی مناسب رہے گی۔

ہیومن ریسورس ڈویلپمنٹ کی پیش کردہ تعریفوں اور فی زمانہ ان پر عمل میں سب سے زیادہ زور مہارتوں کی نشوونما پر ہے۔ یہ مہارتیں بھی صرف ایک خاص جہت پر مرکوز رہتی ہیں۔ یعنی دنیاوی منفعت اور منافع میں زیادہ سے زیادہ اضافہ کرنا۔ گویا ساری مہارات کا حصول صرف اس لیے ہے کہ اس سے مادیت کو ترقی ملے خواہ اس کے نتیجے میں انسانیت سسکتی اور تڑپتی رہے۔ جہاں تک تصورات کا تعلق ہے یہاں پر بھی ہم صرف ادنیٰ درجے کو حاصل کرتے ہیں، جو صرف چند اصطلاحات کے استعمال اور معلومات کی سطحی تفہیم پر مشتمل ہوتا ہے۔ یہاں بھی اصل مدعا اور ہدف مادی منفعت کا اضافہ اور کاروباری پھیلاؤ ہی رہتا ہے۔ مثلث کا ایک نہایت اہم عنوان وہ اقدار (values) ہیں جن پر عمارت قائم ہوتی ہے۔ ہمارے خیال میں مہارتوں کو اعلیٰ اقدار کے تابع ہونا چاہیے۔ اگر ایسا نہیں ہوا تو معاشرے میں ایک بگاڑ اور عدم توازن پیدا ہوگا۔ ہیومن ریسورس ڈویلپمنٹ میں اقدار کا جتنا وزن ہونا چاہیے اور یہ جتنا بنیادی، واضح اور نمایاں ہونا چاہیے، وہ ہمارے نصاب میں شامل نہیں ہوتا۔ اگر کسی بنک کا مینیجر خود ہی ڈکیتی میں ملوث ہو تو یہ مہارتوں کا مسئلہ ہے یا کردار کا۔ پاکستانی قوم کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ہم کسی کام کو ٹھیک طریقے سے کرنے کے لیے اسے کم از کم تین مرتبہ انجام دیتے ہیں۔ آخر ہم پہلی ہی بار سڑک کو صحیح کیوں نہیں بناتے؟ کیا ہمارے ہاں صلاحیت کا فقدان ہے؟ مہارتوں میں کمی ہے؟ یا ہمارا کیرکٹر ہم سے کم تر درجے کا کام کرواتا ہے۔ یاد رکھیے کہ مہارتوں اور صلاحیتوں کے حصول کی خواہش بھی اعلیٰ کردار کی رہین منت ہے۔ گویا ایک بار پھر اقدار کی اہمیت معلوم ہوئی۔

ہمارے ہاں بدقسمتی سے دینی فکر کے حامل ادارے یا اسلامی مشنری ادارے فرد کی نشو ونما و ترقی کی کوششیں اس طرح انجام دیتے ہیں کہ اس فرد کو اپنے خالق سے جزوی آگہی تو شاید ہو جاتی ہے لیکن وہ دنیا میں اپنا مؤثر کردار کرنے کی استعداد نہیں رکھتا۔ اس کی وجہ نشو ونما و ترقی کے جزوی پہلو پر نظر ہے جس کے ثمرات بھی جزوی نکلتے ہیں اور فرد خلافتِ ارضی کے منصب کے لیے درکار قوت، صلاحیت، ذہانت، استعداد اور مہارتوں سے نابلد رہتا ہے۔ دوسری جانب کاروباری نوعیت کے ادارے صرف اور صرف مالی منفعت اور کاروباری وسعت کو ذہن میں رکھتے ہیں، چنانچہ افرادِ کار کی نشو ونما و ترقی اسی کے مطابق کی جاتی ہے جس سے فرد کی دنیا تو شاید سنور جائے لیکن وہ آخرت کی فکر سے بالکل آزاد ہوتا ہے۔ اصل مطلوب متوازن شخصیت کی تیاری ہے جس کے لیے ہمیں شخصیت کی نشو ونما و ترقی کے تمام زاویوں پر نگاہ رکھنی ہوگی۔ انسانی نشو ونما و ترقی کا یہ تصور عین دین ہے۔

چند گزارشات

اسلامی تناظر میں ہیومن ریسورس ڈویلپمنٹ کے اس اہم کام کے ضمن میں آجروں اور متعلقہ ذمہ داروں کے لیے درج ذیل نکات پیش خدمت ہیں۔ فرد کی ہمہ جہت ترقی و نشو ونما کے لیے یہ نکات پیش نظر رکھے جائیں۔ ہیومن ریسورس منیجر کو چاہیے کہ وہ ان امور پر توجہ دے اور اپنی ٹیم میں ان کو پروان چڑھائے۔ یہ تربیتی نصاب کا حصّہ بھی ہوں اور کمپنی پالیسی میں شامل بھی۔ نیز ادارے کی اہم اقدار (core values) میں بھی جگہ پائیں۔ یہ نکات فرد کی ترقی و نشو ونما اور بڑھوتری کی تمام جہتوں کا احاطہ کرتے ہیں:

○ صحیح فکر کی طرف رہنمائی کرنا ○ عقائد اور تصورات کو اللہ کے لیے خالص کرنا ○ نیت و ارادے کو درست کرنا ○ صحیح اور غلط کی تمیز و تفریق پیدا کرنا ○ مشاہداتی صلاحیت کی نشو ونما کرنا ○ تجزیاتی صلاحیت کی نشو ونما کرنا ○ مسائل کا ادراک اور اس کے حل کی استعداد پیدا کرنا ○ حکمت و دانش کے حصول کی تربیت کرنا ○ اپنے کام کو کما حقہ انجام دینے کی تربیت دینا ○ حسنِ عمل کی جستجو پیدا کرنا ○ مخفی صلاحیتوں کو دریافت کرنا ○ جملہ صلاحیتوں کی نشو ونما کرنا ○ باہمی تعلقات کی بنیاد اخوت پر رکھنا ○ بے غرض اور مخلصانہ رویوں کی تشکیل کرنا ○ سلام کا

رواج عام کرنا ○ خندہ پیشانی اور خوش دلی سے ملنا ○ بڑوں (عمر اور مرتبہ) سے احترام اور چھوٹوں (عمر و مرتبہ) پر شفقت سے پیش آنا ○ لہجے میں نرمی اور شایستگی رکھنا ○ افرادکار کا باہمی ربط و تعلق استوار کرنا ○ خوشی اور غمی میں شرکت کرنا ○ کمیونٹی کے کاموں میں شرکت اور خدمت انجام دینا ○ پاک صاف ماحول فراہم کرنا ○ افراد کی صحت و تندرستی کی فکر و توجہ رکھنا ○ علاج و معالجہ، طعام، بودو باش وغیرہ کا انتظام کرنا ○ ہوا، روشنی و دیگر حفاظتی امور کا بندوبست کرنا ○ خوف، غصہ، لالچ، طمع اور حسد جیسے جذبات و رجحانات کو مثبت رخ دینا ○ ذہنی سکون، اطمینان قلب اور فکری یکسوئی کے حصول کی کوشش کرنا ○ اختیارات و ذمہ داریوں میں توازن قائم رکھنا ○ افرادکار میں جذباتی توازن پیدا کرنا ○ گفتگو، معاملات لین دین میں سچائی اور دیانت کو پروان چڑھانا ○ اپنے رب کی معرفت کے حصول کی طرف توجہ دینا ○ آخرت میں جواب دہی کا احساس پیدا کرنا ○ تمام تر معاملات میں اللہ کا دھیان رکھنا۔

ہیومن ریسورس ڈویلپمنٹ، یعنی انسانی وسائل کی ترقی کا مطلوب یہ ہے کہ ایک فرد کی تعلیم و تربیت اور ترقی و نشوونما ایسی ہو کہ وہ دنیا میں ایک کامیاب انسان کے طور پر ابھرے اور آخرت میں جنت کا حق دار ٹھیرے۔ چونکہ ہر فرد راعی ہے، اور اسے اپنی رعیت کے بارے میں اللہ کے حضور جواب دینا ہے (کلکم راع و کلکم مسؤل عن رعیتہ)، لہٰذا مسلمان مینیجر اور اداروں کو اس سے مفر نہیں ہوسکتا کہ وہ یہ کام کریں۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فرمانِ باری تعالیٰ! جو لوگ کتاب اللہ کی تلاوت کرتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں اور جو کچھ رزق ہم نے انہیں دیا ہے اس میں سے کھلے اور چھپے خرچ کرتے ہیں، یقیناً وہ ایک ایسی تجارت کے متوقع ہیں جس میں ہرگز خسارہ نہ ہوگا۔ (فاطر:29)

محترم جناب ________________

السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہٗ امید ہے آپ خیریت سے ہونگے۔

عید الاضحیٰ کی آمد آمد ہے اور دنیا بھر میں مسلمان اِس کے استقبال اور سنتِ ابراہیمؑ کی ادائیگی کے لیے تیاریوں میں مصروف ہیں۔

شہدائے اسلام فاؤنڈیشن (رجسٹرڈ) نے دوسال قبل ایک خوبصورت منصوبے کا آغاز کیا جس کے تحت ملک بھر میں شہداء کے ضرورت مند گھرانوں میں قربانی کے جانور فراہم کیے گئے۔

آپ سے اپیل ہے کہ شہداء کے یتیم بچوں، بیواؤں، بزرگوں اور غریب ونادار گھرانوں کو عید الاضحیٰ کی خوشیوں میں شامل کرنے کے اس منصوبے میں بھرپور تعاون فرمائیں۔

مؤرخہ **10** دسمبر تک اپنے حصے کی قربانی کی رقم فاؤنڈیشن کو فراہم کردیں تاکہ قربانی کے جانور شہداء کے گھروں میں بروقت پہنچانے کا اہتمام کیا جاسکے۔

آپ اپنے تعاون اور قربانی کی رقم جماعت اسلامی کے مقامی دفاتر میں جمع کروایئے یا چیک/ڈرافٹ/منی آرڈر کے ذریعے براہ راست دفتر فاؤنڈیشن کو ارسال کردیں اور بذریعہ فون/ای میل ہمیں بھی اطلاع کردیں۔

برائے رابطہ:
اظہر اقبال حسن
سیکرٹری جنرل
Mob:0300 8481947
email:azharih@hotmail.com

والسلام
حافظ محمد ادریس
چیئرمین

بکرا، دنبہ، مینڈھا......7000 روپے گائے میں ایک حصہ......4000 روپے

شہدائے اسلام فاؤنڈیشن (رجسٹرڈ)

700-عمر بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور 54580 (پاکستان) فون: 042-5410787 فیکس: 042-5425188

ای میل: sifpak@gmail.com sifpak@hotmail.com ویب سائٹ: www.sif.org.pk

اقبال اور جوانانِ ملّت

رفیع الدین ہاشمی°

کلامِ اقبال پر ایک مجموعی نظر ڈالیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے دیگر تمام طبقوں سے بڑھ کر نوجوان طبقے اور بالخصوص نوجوانانِ ملت کو مخاطب کیا ہے۔

علامہ اقبال نے مسلم نوجوانوں کو مخاطب کر کے انھیں عرفانِ نفس اور شعورِ ذات کا درس دیا۔ بالفاظِ دیگر ان کے اندر احساسِ خودی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ انھیں مسلمانوں کے شان دار ماضی، آبا و اجداد کی شان و شوکت اور تاریخِ اسلامی کی عظمت سے روشناس کرایا، ان کے سامنے دورِ حاضر کے پُر آشوب حالات کی ایک عبرت خیز تصویر پیش کی اور پھر ان کے دل میں احیاے دین و ملت کی تمنا بیدار کر کے انھیں ایک ولولۂ تازہ عطا کیا ؎

اک ولولۂ تازہ دیا میں نے دلوں کو
لاہور سے تا خاکِ بخارا و سمرقند (ضربِ کلیم، ص۲۳)

نوجوانانِ ملت سے مکالمہ کرتے ہوئے اپنی شاعری میں علامہ اقبال ان مراحل کا ذکر بڑے حکیمانہ انداز میں کرتے ہیں۔ بعض نظموں میں تو وہ براہِ راست نوجوانوں سے مخاطب ہیں، جیسے 'طلبۂ علی گڑھ کالج کے نام' یا 'خطاب بہ نوجوانانِ اسلام' یا 'ایک فلسفہ زدہ سید زادے کے نام' وغیرہ۔ ابتدائی دور کی نظم 'عبدالقادر کے نام' (بانگِ درا، ۱۳۲) بظاہر فردِ واحد کے نام ہے لیکن فی الحقیقت اس نظم کے حوالے سے، اقبال نے عام نوجوانوں تک اپنی بات پہنچانے کی کوشش کی

○شعبۂ اقبالیات، پنجاب یونی ورسٹی، لاہور

ہے۔ یہ نظم سب سے پہلے مخزن میں شائع ہوئی تھی۔ زمانی اعتبار سے یہ پہلی نظم ہے، جس میں شاعر کے پُر جوش اور ولولہ انگیز خیالات کا اظہار ملتا ہے۔

شیخ عبدالقادر اقبال کے نہایت قریبی اور گہرے دوست تھے۔ ہندستان کے ادبی حلقوں تک اقبال کا نام اور کلام پہنچانے میں شیخ صاحب کے رسالے مخزن کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے اقبال کے سفر انگلستان میں شیخ عبدالقادر کی تجاویز و تلقین کا بھی دخل رہا۔ (نذر اقبال، ۱۶۴، ۱۷۴، ۱۷۶)۔ پھر قیام یورپ کے دوران میں جب انھوں نے ترکِ شعر کا ارادہ کیا تو یہ شیخ صاحب ہی تھے جن کے حسنِ تدبیر سے اقبال ترکِ شعر سے باز رہے (دیباچہ: بانگِ درا، ۱۵)۔ اقبال کو شیخ عبدالقادر کے ذوق و ذہن، ملت اور قوم کے لیے ان کے پُرخلوص جذبات، ان کی دردمندانہ سوچ اور خیرخواہانہ مساعی کا بخوبی احساس تھا، اسی لیے انھوں نے بطورِ خاص شیخ صاحب کو مخاطب کیا ؎

اٹھ کہ ظلمت ہوئی پیدا اُفقِ خاور پر
بزم میں شعلہ نوائی سے اُجالا کردیں (بانگِ درا، ۱۳۲)

قابلِ غور بات یہ ہے کہ یہ اقبال کی جوانی کا زمانہ تھا۔ انھوں نے اپنے ہم مزاج اور ہم عمر شیخ عبدالقادر ہی کو خطاب کے لائق سمجھا' تاہم اُن کے توسّط سے یہ خطاب، اُس دور کے تمام دردمند اور صاحبِ احساس نوجوانوں سے تھا۔ اقبال جب 'شعلہ نوائی سے اُجالا' کرنے 'قیس کو آرزوے نو سے شناسا' کرنے یا 'بزم گہِ عالم کو منور' کرنے کا عزم ظاہر کرتے ہیں تو یوں معلوم ہوتا ہے جیسے ایک جدید تعلیم یافتہ نوجوان، جس کا سینہ بلند عزائم سے پُر ہے اور پختہ صالح ارادوں، اُمنگوں اور ولولوں کی آماجگاہ بنا ہوا ہے، وہ جذبات سے معمور اپنے دل' لگن اور حرارت اور اپنے سوزوگداز سے زندگی میں ایک انقلاب برپا کرنے کا خواہاں ہے۔ بقول غلام رسول مہر: ''قوم کی عملی خدمت کے لیے کمربستہ ہونے کا یہ پہلا اعلان'' تھا۔ (مطالب بانگِ درا، ۲۰۹)

'خطاب بہ جوانانِ اسلام' (بانگِ درا، ۱۸۰) اس سلسلے کی ایک اور اہم نظم ہے۔ اس کا زمانہ ذرا بعد کا ہے، اسی لیے اس کے لہجے اور آہنگ میں مذکورہ بالا نظم کا سا جوش و خروش نہیں، اس کے بجاے اس میں تفکر اور سوچ بچار کا انداز غالب ہے۔ فرماتے ہیں ؎

کبھی اے نوجواں مسلم، تدبّر بھی کیا تو نے
وہ کیا گردوں تھا، تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا (بانگِ درا، ۱۸۰)

چند اشعار کی اس نظم میں علامہ نے بطور پس منظر، ملتِ اسلامیہ کے شان دار اور سنہرے ماضی کا ذکر کیا ہے۔ یہاں خاص طور پر قرنِ اوّل کے مسلمانوں کی طرف بعض بلیغ اشارات کے ذریعے، انھوں نے امتِ مسلمہ کے عروج و زوال کی پوری داستان بیان کر دی ہے۔ قابلِ غور بات ہے کہ اس میں خطاب، نوجوان مسلم سے ہے۔ علامہ نے کوشش کی کہ نوجوان مسلم کے دل میں اس کے حقیقی مقام و مرتبے کا شعور پیدا کر کے، اسے بتایا جائے کہ اس مقام اور مرتبے کے کھو جانے کی وجوہ کیا ہیں۔ نظم کے ایک مصرعے (کہ تو گفتار، وہ کردار، تو ثابت، وہ سیارا) میں نہایت کفایت لفظی سے اس تضاد کی طرف توجہ دلائی ہے جو قرنِ اوّل اور دورِ حاضر کے مسلم نوجوانوں کے کردار میں نظر آتا ہے۔ یہ مصرع ایک آئینہ ہے جس سے آج کے نوجوانوں کے ہاں بے عملی، تساہل، غفلت، لاپروائی، غیر ذمہ داری اور ایک مجموعی جمود کی کیفیت صاف اور صریح طور پر نظر آ رہی ہے۔

اقبال کا زمانہ، برطانوی استعمار کے عروج کا زمانہ تھا، چنانچہ وہ غلامی کے اس ماحول میں پلے بڑھے، اس لیے نوجوانوں کی کمزوریوں (کہ تو گفتار، وہ کردار۔۔۔) سے بخوبی آگاہ تھے۔ ان کی متعدد نظموں، مثلاً 'جاوید کے نام' (بالِ جبریل، ۱۷۴) ''طلبہ علی گڑھ کالج کے نام' (بانگِ درا، ۱۱۴) 'ایک فلسفہ زدہ سید زادے کے نام' (ضربِ کلیم، ص ۱۸) اور 'سخنے بہ نژادِ نو' (جاوید نامہ، ۱۹۹) میں ان کمزوریوں اور کوتاہیوں کا ذکر ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ، یہ نظمیں، نژادِ نو کے بارے میں اقبال کی امیدوں، آرزوؤں اور ولولوں کا خوب صورت اظہار بھی ہیں:

ترے صوفے ہیں افرنگی، ترے قالیں ہیں ایرانی
لہو مجھ کو رلاتی ہے جوانوں کی تن آسانی
عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں
نظر آتی ہے اس کو اپنی منزل آسمانوں میں (بالِ جبریل، ۱۱۹-۱۲۰)

'سخنے بہ نژادِ نو' اس اعتبار سے ایک اہم نظم ہے کہ دورِ آخر کی اس طویل نظم میں علامہ نے نئی نسل کے بارے میں اپنے احساسات کو بڑی تفصیل اور جامعیت کے ساتھ قلم بند کر دیا ہے۔ نژادِ نو کی

چند کمزوریوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ یہ بڑی افسوس ناک صورت حال ہے کہ:

نوجواناں تشنہ لب، خالی ایاغ
شستہ رو، تاریک جاں، روشن دماغ
کم نگاہ و بے یقین و نااُمید
چشم شاں اندر جہاں چیزے ندید (جاوید نامہ، ۲۰۲)

(نوجوان پیاسے ہیں مگر ان کے جام خالی ہیں۔ چہرے چمک دار، دماغ روشن مگر اندرون تاریک۔ بے چارے کم نگاہ، بے یقین اور مایوس ہیں۔ انھیں دنیا میں کچھ نظر ہی نہیں آتا۔)

علامہ اقبال کے ایک مدّاح اور اُن کی صحبت و ملاقات سے فیض یاب ہونے والے عالم جناب ممتاز حسن نے ایک جگہ لکھا ہے کہ: ''ان کے پاس سب سے زیادہ نوجوان طالب علم آتے تھے اور صرف لاہور ہی سے نہیں، بلکہ دُور دُور سے۔ اقبال کو نوجوانوں سے مل کر اور ان سے باتیں کر کے بڑی خوشی ہوتی تھی، اور ان لوگوں کو بھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اقبال ان کے ہم عمر ہیں''۔

ایک ماہر طبیب کی طرح، علامہ کا ہاتھ زمانے کی نبض پر ہے اور وہ نئی نسل کے امراض کا بخوبی ادراک رکھتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ بے یقینی و بے اعتمادی اور ریب و تشکیک کا شکار ہے۔ خودی سے محروم ہے، اس لیے اپنی ذات پر بھروسا نہیں ہے اور چونکہ خودشناس نہیں، اس لیے خداشناسی کی نعمت بھی حاصل نہیں۔ وہ اپنے ماضی کا عرفان رکھتا ہے، نہ اسے اپنے حال کی خبر ہے اور نہ مستقبل پر یقین ہے۔ علامہ سمجھتے ہیں کہ بے یقینی نوعِ انسان کے لیے ایک مہلک مرض ہے اور 'ذوقِ یقین' سے محروم شخص کی حالت غلاموں سے بھی بدتر ہوتی ہے (ع : غلامی سے بتر ہے بے یقینی۔ بالِ جبریل، ۳۷۴)۔ نژادِ نو کو اس بیماری سے نجات دلانے کے لیے، اقبال سب سے پہلے اسے لا الٰہ کا درس دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں ؎

اے پسر! ذوقِ نگہ از من بگیر
سوختن در لا الٰہ از من بگیر (جاوید نامہ، ۱۹۹)

(اے بیٹے! ذوقِ نگہ [کا شعور و ادراک، بصیرت اور معیارِ انتخاب] مجھ سے سیکھو۔ لا الٰہ کا سوز کیا ہے؟ [اور اس میں کیا لذت ہے؟] یہ بھی مجھ سے سیکھو۔)

لا اِلٰہَ الاّ اللّٰہ ہی وہ نسخۂ کیمیا ہے جو بنی نوع انسان اور خاص طور پر نژادِنو کی بے یقینی، بے اعتمادی، فکر ونظر کی لغزشوں اور کردار کی جملہ کمزوریوں کا تیر بہدف علاج ہے۔ 'بتانِ وہم وگماں' اس سے شفا یاب اور سود و زیاں کے مغالطے لا اِلٰہَ الاّ اللّٰہ سے بے نقاب ہوتے ہیں۔ علامہ فرماتے ہیں: اے عزیزانِ من، لا الٰہ کو فقط دو حرف نہ سمجھو، یہ ایک 'تیغِ بے زنہار' ہے اور یہ دو حرف 'ضربِ کاری' کی سی قوت کے حامل ہیں۔

اس کے ساتھ ساتھ علامہ اقبال، قرآن سے وابستگی کو نئی نسل کے لیے ناگزیر قرار دیتے ہیں۔ 'سخنے بہ نژادِ نو' میں وہ تعجب کا اظہار کرتے ہیں کہ اُمتِ مسلمہ، صاحبِ قرآن ہونے کے باوجود ذوقِ طلب سے محروم ہے۔ نوجوانوں کو ان کی تلقین یہ ہے کہ وہ قرآن حکیم سے دلی وابستگی پیدا کریں' کیوں کہ یہی ذریعہ ہے استحکامِ خودی، ذوقِ طلب، یقین واعتماد اور جذبِ اندروں کے حصول کا۔ اور ہماری فوز وفلاح، دنیاوی کامرانی اور اُخروی نجات قرآن پر عمل پیرا ہونے سے مشروط ہے۔

علامہ کہتے ہیں کہ سو خرابیوں کی ایک خرابی تو یہ ہے کہ مکتب کی تعلیم نے نوجوانوں کی فطرت کو مسخ کر دیا ہے ؎

نورِ فطرت را ز جاں ہا پاک شست
یک گلِ رعنا ز شاخِ او نرست (جاوید نامہ، ۲۰۲)

(اہلِ مکتب نے نوجوانوں کی جانوں سے نورِ فطرت کو دھو دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مکتبوں کی شاخ سے ایک گلِ رعنا بھی نہیں پھوٹا۔)

اقبال کہتے ہیں کہ حقیقی علم فقط کتابوں سے حاصل نہیں ہوتا، اس کے لیے کسی صاحبِ نظر کی طرف رجوع ضروری ہے۔ (ع ترا علاج نظر کے سوا کچھ اور نہیں۔ بال جبریل، ۴۷) علامہ، اپنی اس بے مثال نظم میں نئی نسل کو حسب ذیل نصیحتیں بھی کرتے ہیں:

۱- عدل وانصاف کو ہاتھ سے نہ دو۔
۲- اعتدال اور میانہ روی اختیار کرو۔
۳- احکامِ الٰہی کو اپنی گرہ میں باندھ لو۔
۴- اپنے قلب سے روشنی حاصل کرو۔

۵- ضبطِ نفس سے اپنی جوانی کی حفاظت کرو۔

۶- اور فقر و درویشی کو اپنی زندگی کا عنوان (motto) بناؤ۔

فقر و درویشی کے ضمن میں علامہ اقبال نے شاہین کو ایک مثالی پرندے کے طور پر پیش کیا ہے۔ شاہین مسلم نوجوان کے لیے ایک استعارہ بھی ہے۔ اس حوالے سے اقبال نئی نسل میں فقر، درویشی، قناعت، استغنا، خودداری، اور بلند پروازی کی صفات دیکھنا چاہتے ہیں اور یہ صفات اس وقت تک نوجوانوں کے اندر پیدا اور راسخ نہیں ہوسکتیں، جب تک وہ سخت کوشی کو اپنی زندگی کا شعار نہ بنائیں۔ (ع سخت کوشی سے ہے تلخِ زندگانی انگبیں۔ بال جبریل، ۱۲۱)

مختصر یہ کہ یہ نظم اقبال کے مثالی نوجوان کا ایک نہایت عمدہ خاکہ پیش کرتی ہے۔ اُوپر ذکر ہوا ہے کہ علامہ اقبال نئی تعلیم کو نوجوانوں کے حق میں زہرِ ہلاہل سمجھتے تھے (ع لادیں ہو تو ہے زہرِ ہلاہل سے بھی بڑھ کر۔ ضرب کلیم، ۲۹)' کیونکہ یہ تعلیم اسے عقل پرستی اور مادّیت و لادینیت کا اسیر بناتی ہے۔

اقبال جدید دور کی مادیت کو نوجوانانِ ملت کے لیے بہت بڑا فتنہ سمجھتے تھے۔ ۱۹۳۱ء میں انگلستان میں نوجوانوں کے ایک گروہ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا: ''میں نوجوانوں کو نصیحت کرتا ہوں کہ وہ دہریت اور مادیت سے محفوظ رہیں۔ اہلِ یورپ کی سب سے بڑی غلطی یہ تھی کہ انھوں نے مذہب و حکومت کو علاحدہ علاحدہ کردیا۔ اس طرح ان کی تہذیب روحِ اخلاق سے محروم ہوگئی اور اس کا رُخ دہریانہ مادیت کی طرف پھر گیا'' (گفتار اقبال، ۲۵۴)۔ حقیقت تو یہ ہے کہ علامہ اقبال جوانانِ ملّت کو اپنی اولاد کی طرح عزیز رکھتے تھے۔ جاوید کے نام پند و نصیحت کو، وہ 'سخنے بہ نژادِ نو' قرار دے کر پیش کرتے ہیں۔ نئی نسل انھیں اپنے دونوں بیٹوں (آفتاب اقبال، جاوید اقبال) میں سے عزیز تر جاوید اقبال ہی کی طرح عزیز تھی اور وہ اپنی اولاد کی طرح ہی اس کے خیر خواہ تھے، چنانچہ پند و نصائح کے ساتھ ساتھ، اقبال ہمیشہ ان کے لیے دعا گو بھی رہے۔ ۲۹ نومبر ۱۹۲۹ء کو وہ علی گڑھ میں تھے۔ یونی ورسٹی سٹوڈنٹس یونین نے ان کے اعزاز میں جلسہ منعقد کرکے، انھیں یونین کی 'آنریری لائف ممبرشپ' دی اور ایک سپاس نامہ پیش کیا تو جوابی تقریر میں فرمایا: ''گذشتہ چند سال سے میں صرف جسد خاکی کا مالک ہوں۔ میری روح ہمیشہ آپ کی خدمت کے لیے حاضر رہی ہے

اور جب تک زندہ ہوں، وہ آپ کی خدمت کرتی رہے گی" (گفتار اقبال، ۱۰۳)۔ اکبرالٰہ آبادی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں: "صرف ایک بے چین اور مضطرب جان رکھتا ہوں۔ قوتِ عمل مفقود ہے۔ ہاں، یہ آرزو رہتی ہے کہ کوئی قابل نوجوان جو ذوقِ خداداد کے ساتھ قوتِ عمل بھی رکھتا ہو، مل جائے جس کے دل میں اپنا اضطراب منتقل کردوں۔" (اقبال نامہ، ۳۸۲)

اس اضطراب اور خدمت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ وہ جوانانِ ملت کی تنظیم و تربیت کے متمنی تھے۔ ۲۱ مارچ ۱۹۳۲ء کو لاہور میں آل انڈیا مسلم کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے انھوں نے تنظیماتِ نوجوانان (Young Leagues) قائم کرنے کی تجویز پیش کی جو ایک مرکزی تنظیم کے تحت سماجی خدمت، نامطلوب رسوم و رواج کی اصلاح اور معاشرے کی اقتصادی فلاح و بہبود کے کام انجام دے۔ (*Speeches*، ۴۱) مولانا راغب احسن نے ۱۹۳۱ء میں آل انڈیا یوتھ لیگ قائم کی (اقبال، جہان دیگر، ۳۰) تو انھیں تلقین کی کہ جمعیت کو زیادہ فعال اور منظم بنائیں۔ لکھتے ہیں: "مقصد صرف تربیت ہونا چاہیے اور اس کے ساتھ ڈسپلن۔ تربیت سے مراد وہ طریق ہے جس سے مسلمان نوجوانوں میں دینی حرارت پیدا ہو"۔ (اقبال نامہ)

جوانانِ ملت کے لیے اقبال کی نیک تمناؤں اور دعاؤں کا تذکرہ ان کی شاعری میں بھی کئی مقامات پر ملتا ہے۔ بال جبریل کی نظم 'ساقی نامہ' میں کہتے ہیں:

جوانوں کو سوز جگر بخش دے
مرا عشق، میری نظر بخش دے
مرے دیدۂ تر کی بے خوابیاں
مرے دل کی پوشیدہ بے تابیاں
مرے نالۂ نیم شب کا نیاز
مری خلوت و انجمن کا گداز
امنگیں مری، آرزوئیں مری
امیدیں مری، جستجوئیں مری
مرے قافلے میں لٹا دے اسے
لٹا دے، ٹھکانے لگا دے اسے (بالِ جبریل ۱۲۴-۱۲۵)

سوال یہ ہے کہ یہ اضطراب، حضرت علامہ نوجوانوں ہی کو کیوں منتقل کرنا چاہتے ہیں؟ امت مسلمہ کے عمر رسیدہ و آزمودہ کار اور جہاں دیدہ اصحاب کے بجاے انھوں نے نوجوانوں کا انتخاب کیوں کیا؟ اور جب وہ یہ کہتے ہیں کہ: 'جوانوں کو پیروں کا استاد کر' (بال جبریل، ۱۲۴)، تو اس کا حقیقی محرک کیا تھا؟

ہمارے خیال میں، پیروں اور بزرگوں کی تمام تر فہم و دانش، طویل زندگی کے تجربات اور بزرگی کے باوجود، جوانوں کو اُن پر ترجیح کا سبب غالباً یہ تھا کہ تاریخ اسلام کے ہر دور میں دعوتِ حق کی پکار پر لبیک کہنے والوں میں نوجوان ہمیشہ پیش پیش رہے ہیں۔ حق و باطل کی پیکار میں انھوں نے ہر طرح کے سود و زیاں سے بے نیاز ہو کر حق و صداقت کا ساتھ دیا۔ یہ حقیقت معرکۂ فرعون و کلیم سے آنحضورؐ کے دور تک اسلام اور جاہلیت کی کش مکش میں ہمیشہ بہت نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ قرآن حکیم میں ایک مقام پر فرمایا گیا ہے کہ:

فَمَآ اٰمَنَ لِمُوْسٰٓی اِلَّا ذُرِّیَّۃٌ مِّنْ قَوْمِهٖ عَلٰی خَوْفٍ مِّنْ فِرْعَوْنَ وَ مَلَا۠ئِهِمْ اَنْ یَّفْتِنَهُمْ (یونس ۱۰: ۸۳) (پھر دیکھو کہ) موسیٰ کو اس قوم میں سے چند نوجوانوں کے سوا کسی نے نہ مانا، فرعون کے ڈر سے اور خود اپنی قوم کے سربرآوردہ لوگوں کے ڈر سے (جنھیں خوف تھا کہ) فرعون ان کو عذاب میں مبتلا کرے گا۔)

گویا اس پرآشوب اور پرخطر زمانے میں جب فرعون اور حضرت موسیٰ کلیم اللہ کے درمیان ایک زبردست کش مکش برپا تھی، حق کا ساتھ دینے اور حضرت موسیٰ کو اپنا رہنما تسلیم کرنے کی جرأت فقط چند لڑکوں نے کی۔ اُمتِ موسیٰؑ کے عمر رسیدہ لوگ مصلحت کوشی اور عافیت پرستی کا شکار ہو کر رہ گئے۔ نہ صرف یہ کہ وہ خود حق کا ساتھ دینے پر آمادہ نہ ہوئے، بلکہ نوجوانوں کو بھی موسیٰ کی پیروی سے روکتے رہے تاکہ وہ فرعون کے غیظ و غضب سے محفوظ رہ سکیں۔ سرزمینِ عرب میں آنحضورؐ نے دعوتِ حق پیش کی تو آپؐ پر ایمان لانے والوں میں بڑے بوڑھوں اور سن رسیدہ لوگوں کے بجاے اولیت کا شرف بھی نوجوانوں ہی کو حاصل ہوا۔ ان باہمت نوجوانوں کی عمریں قبولِ اسلام کے وقت اس طرح تھیں:

۱- ۲۰ سال سے کم عمر: علی ابن ابی طالب، جعفر بن طیار، زبیر، طلحہ، سعد بن ابی وقاص، مصعب بن عمیر، عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم۔

۲- ۲۰ اور ۳۰ سال کے درمیان: عبدالرحمٰن بن عوف، بلال، صہیب رضی اللہ عنہم۔

۳- ۳۰ اور ۳۵ سال کے درمیان: ابوعبیدہ ابن الجراح، زید بن حارث، عثمان غنی، عمر فاروق رضی اللہ عنہم۔

اس تاریخی حقیقت کی بنا پر جس کی شہادت قرآن حکیم پیش کر رہا ہے، علامہ بجا طور پر یہ محسوس کرتے تھے کہ اُمت مسلمہ کے مختلف طبقات میں سے صرف نوجوان ہی وہ طبقہ ہے جو ذوقِ عمل کی دولت سے مالا مال ہے اور انھی کے ہاتھوں انقلاب برپا ہوسکتا ہے، اس لیے اقبال نے اپنی تمام امیدیں نوجوانوں سے وابستہ کرلی تھیں۔ مزید برآں قریبی زمانے کی مسلم تاریخ اور ہم عصر مسلم معاشرے کے عمیق مطالعے کے بعد' حضرت علامہ نوجوانوں کے سوا، ملت کے تمام گروہوں سے تقریباً مایوس ہوگئے تھے۔ مایوسی کا یہ احساس مختلف اصحاب کے نام لکھے گئے خطوط میں خاصا نمایاں ہے۔ آخر زمانے کے ایک خط (بنام چودھری نیاز علی خاں مرحوم) میں ان کی سوچ کا یہ رخ بہت دوٹوک اور واضح نظر آتا ہے۔ لکھتے ہیں:

> علما میں مداہنت آگئی ہے۔ یہ گروہ حق کے کہنے سے ڈرتا ہے۔ صوفیہ اسلام سے بے پروا اور حکام کے تصرف میں ہیں۔ اخبارنویس اور آج کل کے تعلیم یافتہ لیڈر خودغرض ہیں۔ ذاتی منفعت اور عزت کے سوا کوئی مقصد ان کی زندگی کا نہیں۔ عوام میں جذبہ موجود ہے مگر ان کا کوئی بے غرض راہ نما نہیں ہے۔ (اقبال نامہ، ۲۲۳)

چنانچہ اقبال اپنے برس ہا برس کے مطالعے، مشاہدے اور ذاتی تجربے کے بعد اپنی تمام تر توقعات صرف اور صرف نوجوانوں سے وابستہ کرلینے میں حق بجانب تھے۔ ان کے ہاں عقل پر عشق کی ترجیح اور شاہین کی ایک مثالی پرندے کی حیثیت سے تعریف و توصیف اسی نکتے کی تفسیریں ہیں۔ نوجوانوں سے امیدیں وابستہ کرلینے کے بعد' وہ بے چین ہوئے تو انھی کے لیے، تڑپے اور مضطرب ہوئے تو انھی کے لیے، ان کی دعائیں اور نیک تمنائیں' اُمنگیں اور آرزوئیں انھی کے لیے وقف ہوگئیں:

جوانوں کو مری آہِ سحر دے
پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے
خدایا آرزو میری یہی ہے
مرا نورِ بصیرت عام کردے (بالِ جبریل، ۸۶)

کچھ عجب نہیں کہ اس وقت جبکہ دنیا بھر کے مسلمان ابتلا و آزمایش کا شکار ہیں اور عالمِ اسلام کو سنگین مسائل کا سامنا ہے، حضرت علامہ کی روح آج بھی بے تاب و مضطرب ہو اور اس بات کی منتظر کہ نوجوانوں کے عزائم اور ان کے ارادے اور ولولے اقبال کے مطلوبہ انقلاب کا پیش خیمہ ثابت ہوں۔

۲۱ویں صدی کے آغاز میں جب متمدن اور ترقی یافتہ مغرب، اقبال کے الفاظ میں، ایک بہت بڑے 'قمار خانہ' کی شکل اختیار کر چکا ہے اور وہاں زندگی، علامہ کے اس شعر کی تفسیر بن چکی ہے ؎

بے کاری و عریانی و مے خواری و افلاس
کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کے فتوحات (بالِ جبریل، ۱۰۸)

مسلم نوجوان دورِ جدید کا وہ خوش قسمت انسان ہے جو اسلام کے حیات بخش اور جاں فزا پیغام کی بدولت آج بھی ہر طرح کے ذہنی و فکری انتشار سے محفوظ ہے۔ اقبال کی شاعری' اس نوجوان کی قوتِ عمل کے لیے ایک مہمیز ہے۔ اقبال دورِ حاضر کے مسلم نوجوانوں کو تسکینِ قلب کے لیے منفی اور مصنوعی طور طریقوں کے بجائے' دینِ فطرت کا وہ صراطِ مستقیم دکھاتے ہیں جو اسلامی انقلاب کی شاہراہ ہے۔

مسجد قرطبہ، یورپ میں مسلمانوں کی عظمتِ رفتہ کی ایک خوب صورت یادگار ہے۔ آج سے تقریباً نصف صدی قبل اس کے پہلو میں بہتے دریا وادی الکبیر کے کنارے حضرت علامہ اقبال نے ایک خواب دیکھا تھا:

آبِ روانِ کبیر! تیرے کنارے کوئی
دیکھ رہا ہے کسی اور زمانے کا خواب
عالمِ نو ہے ابھی پردۂ تقدیر میں
میری نگاہوں میں ہے اس کی سحر بے حجاب (بالِ جبریل، ۱۰۱)

مگر یہ سحر عالمِ اسباب میں تاحال بے حجاب نہیں ہوئی۔ اقبال کی چشم نگراں آج بھی اس خواب کی تعبیر دیکھنے کے لیے بے تاب ہے۔ جب ہم ''ساقی نامہ'' کے ان اشعار کو دیکھتے ہیں کہ:

خرد کو غلامی سے آزاد کر
جوانوں کو پیروں کا استاد کر
تڑپنے پھڑکنے کی توفیق دے
دلِ مرتضیٰؓ سوزِ صدیقؓ دے
جگر سے وہی تیر پھر پار کر
تمنا کو سینوں میں بیدار کر
جوانوں کو سوزِ جگر بخش دے
مرا عشق، میری نظر بخش دے (بال جبریل،۱۲۴)

تو غالباً یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ نئی نسل ہی اقبال کے خواب شرمندۂ تعبیر کرسکتی ہے۔

کتابیات

۱- ابوالاعلیٰ مودودی، سیدؒ: تفہیم القرآن، دوم۔مکتبہ تعمیر انسانیت، لاہور، ۱۹۷۱ء

۲- اقبال، علامہ محمد: اقبال نامہ (مرتب: شیخ عطاء اللہ) اقبال اکادمی پاکستان لاہور، ۲۰۰۵ء

۳- اقبال، علامہ محمد: اقبال، جہانِ دیگر (مرتب: محمد فریدالحق) گردیزی پبلشرز کراچی، ۱۹۸۳ء

۴- اقبال، علامہ محمد: کلیات اقبال، اُردو۔شیخ غلام علی لاہور، ۱۹۷۳ء

۵- اقبال، علامہ محمد: کلیات اقبال، فارسی۔شیخ غلام علی لاہور، ۱۹۷۳ء

۶- اقبال، علامہ محمد: Speeches, Writings and Statements of Iqbal مرتب: لطیف احمد شروانی۔اقبال اکادمی پاکستان لاہور، ۱۹۷۷ء

۷- اقبال، علامہ محمد: گفتار اقبال (مرتب: محمد رفیق افضل) ادارہ تحقیقاتِ پاکستان، پنجاب یونی ورسٹی لاہور، ۱۹۶۹ء

۸- عبدالقادر، شیخ سر: نذرِ اقبال (مرتب: محمد حنیف شاہد) بزم اقبال لاہور، ۱۹۷۳ء

۹- ممتاز حسن: مقالاتِ ممتاز (مرتب: شان الحق حقی)۔ادارہ یادگار غالب کراچی، ۱۹۹۵ء

۹- مہر، غلام رسول مہر: مطالبِ بانگِ درا۔شیخ غلام علی لاہور۔۱۹۷۲ء

مغربی دانش وروں کا احساسِ شکست

مولانا محمد ثناء اللہ عمری

مغربی ملکوں میں اسلام پر بحث و گفتگو کا لب و لہجہ تند و تیز ہو چلا ہے۔ اس کا رخ اس خیال کی طرف ہے کہ 'اعتدال پسند اسلام' نام کی کوئی چیز نہیں ہے' اور آج دنیا جو کچھ دیکھ رہی ہے وہ فی الواقع ایک تصادم ہے جو دو متوازی نظام ہائے اقدار کے درمیان برپا ہے' جن میں سے ایک برتر و بالاتر مگر روحانی حیثیت سے دیوالیہ' مغربی نظامِ آزادی اور جمہوریت ہے' اور دوسرا ایک پس ماندہ اور غیر جمہوری اسلام ہے' جو اپنی روحانی طاقت کے خود ساختہ' خوش کن عقیدے پر قائم ہے۔ اس صورت حال سے دو مختلف ردعمل پیدا ہو گئے ہیں۔ ایک طرف عیسائی فتح مندی کا احساس ہے جو بعض مبصرین کی رائے کے مطابق پچھلے سال پاپائے روم کے بیان کی صورت میں سامنے آیا' اور دوسری طرف یہ عام و عالم گیر خوف و اندیشہ ہے کہ مغرب اپنے روحانی 'افلاس' کے باعث اسلام کے خلاف جنگ و جدل جاری نہ رکھ سکے گا۔

عام لوگوں بلکہ دانش وروں کا یہ احساسِ شکست انھیں بہت ستا رہا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اسلام پسند فتح مند ہو رہے ہیں' اور وقت گزرنے کے ساتھ دنیا ایک عظیم خلافت میں بدل جائے گی۔ آزادی اور جمہوریت کی مغربی قدریں اپنی جگہ چھوڑ دیں گی' اور یہ موجودہ تاریخ کا خاتمہ ہوگا۔ تاریخ کے خاتمے سے مقصود فرانسس فاکویاما کا وہ نظریہ نہیں جس کی رو سے سوویت روس میں سوشلزم کے زوال کے بعد مغربی طرز جمہوریت کو دوام حاصل رہے گا' بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ دنیا کو اسلام کی صورت میں ایک متبادل نظام ملے گا۔ یہی نظام اب دنیا کے دروازے پر دستک دے رہا ہے۔

ممتاز ناول نویسوں اور مضمون نگاروں کے پیش کیے ہوئے الہامی مناظر کی بنا پر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سموئیل ہن ٹنگٹن کا تہذیبوں کے تصادم والا نظریہ کسی بھی وقت عملی صورت میں ظاہر ہونے کو ہے۔ ایک اور ناول نگار ڈیوڈ سلبورن نے اپنے ناول The Losing Battle With Islam (اسلام کے مقابلے میں ہاری جانے والی جنگ) میں ۱۰ ایسے معقول اسباب بیان کیے ہیں جن کے ہوتے ہوئے جہاد کے خلاف مغرب کی جنگ میں اسلام کو شکست نہیں دی جاسکے گی۔

ٹائم میں چھپے ایک مضمون میں اس نے تفصیل سے بتایا کہ اسلام کو کس بنا پر بالادستی حاصل ہے، اور یہ اسباب گنوائے ہیں: غیرمسلم ملکوں کے اس بارے میں سیاسی اختلافات کہ اسلامی انتہا پسندی سے کس طرح نمٹا جائے، عالم اسلام کی قوتوں کا غلط اندازہ لگانا، انھیں بے وقعت گردانا، خود اسلام کے مزاج کے متعلق غلط فہمی، مغرب خصوصاً امریکا کی قیادت کا گرتا ہوا معیار، مغربی پالیسی سازی میں انتشار، امریکا کی ناکامیوں پر بہت سے غیرمسلموں کی بے اطمینانی، مغرب کا اخلاقی افلاس و دیوالیہ پن، جہادیوں کے ہاتھوں میڈیا کا ماہرانہ استعمال، عرب اور مسلمان ملکوں کے مادی وسائل پر مغرب کا انحصار، سائنس اور ٹکنالوجی کے بل بوتے پر قائم عصرِ جدید پر اس کا فخر و غرور۔

دی ابزرور نامی اخبار میں برطانیہ کے ایک ناول نویس مارٹن ایمس نے ایک مقالے میں لکھا ہے: ''ابھی کل تک کہا یہ جاتا تھا کہ ہمارا سامنا اسلام کی اندرونی 'خانہ جنگی' سے ہے۔ یہ مختلف تہذیبوں کا تصادم نہیں ہے، محض خانہ جنگی ہے، مگر اب معلوم یہ ہوتا ہے کہ خانہ جنگی ختم ہوچکی، عسکریت پسند اسلام نے میدان مارلیا''۔

مارٹن لکھتا ہے کہ اعتدال پسند مسلمان کم ہیں، ایسے لوگ کھل کر اپنی رائے نہیں دیتے، اور یہ بات اسلامی مزاج کے عین مطابق ہے جہاں اُمت کو فرد پر اوّلیت حاصل ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہاں فرد کوئی اہمیت نہیں رکھتا، جو کچھ ہے وہ اُمت ہی ہے۔ اسلام کی آمرانہ حیثیت اس کے پیروؤں سے اس بات کی متقاضی ہے کہ وہ ذہنی آزادی سے پوری طرح دست بردار ہوجائیں۔ وہ کہتا ہے کہ ایک مسلمان آزاد خیال ہو، یہ ایک متضاد بات ہے۔

واضح رہے کہ اسلام کی حقانیت پر بے چوں و چرا ایمان مغرب کے مقابلے میں ایک

زبردست طاقت ہے، وہ مغرب جس نے اپنی روحانی قوت کھو دی ہے، جو ایمان ویقین کی دولت سے محروم ہے۔ اسلام کے بارے میں یہ بات آج کل بار بار دہرائی جارہی ہے۔ سلبورن کی طرح مارٹن بھی یہ رائے رکھتا ہے کہ ایک بڑا عامل جس نے اسلام پسندوں کی فتح کو ناگزیر بنا کر پیش کیا ہے، وہ بش حکومت کے خلاف عام نفرت ہے جو زیادہ تر عراق میں اس کی ناکامیوں کا نتیجہ ہے۔

مارٹن کہتا ہے: ''سارے مغربی ملکوں میں ایسے بے حدوحساب لوگ ہیں جو عراق میں امریکا کی ناکامی کے دل سے آرزومند ہیں کیونکہ وہ جارج بش سے سخت نفرت رکھتے ہیں۔ غالباً وہ نہیں جانتے کہ امریکا کی ناکامی کی آرزو دراصل اسلامیوں کی فتح یابی کی آرزو ہے جو ایک ڈرامائی انداز سے ان کی آیندہ نسلوں کو بدل کر رکھ دے گی، یہ بات عین ممکن ہے''۔ اس کے بعد مارٹن ایک ایسی خیالی دنیا کی تصویر پیش کرتا ہے جس کے کرتا دھرتا مُلّا قسم کے لوگ ہوں گے۔

اور سنیے امریکی ناول نویس رابرٹ فریگنو (Robert Ferrigno) نے اپنے تازہ ناول Prayers for the Assassin (قاتل کے لیے دعائیں) میں اس سے زیادہ ڈرامائی انداز سے اسلامی فتح مندی کے بعد کا نقشہ کھینچا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ مسلم عسکریت پسند ملک پر چڑھ دوڑیں گے، اسے اسلامی جمہوریہ میں تبدیل کردیں گے، ریاست ہاے متحدہ امریکا کا نام مسلم ریاست ہاے امریکا قرار پائے گا، سیکولر قانون کی جگہ شریعت کا قانون نافذ ہوگا، لاس اینجلس ہوائی اڈا بن لادن ہوائی اڈا ہوگا، ایک بڑا اسٹیڈیم خمینی سے منسوب ہوگا، برقع پوش خواتین سے بھرے ہوئے شہر اذان کی آواز سے گونج اٹھیں گے، کالے عباؤں میں ملبوس پولیس گلی گلی گشت کررہی ہوگی کہ کہیں کوئی نامناسب لباس میں تو نہیں ہے، اس سے کوئی بدتہذیبی تو سرزد نہیں ہورہی ہے!

گو یہ ناول ایک متبادل اسلامی نظام کا ایک افسانوی تخیل ہے، مگر اس کا مصنف اس بات پر پورا یقین رکھتا ہے کہ یہ تصور ایک نہ ایک دن عملی صورت اختیار کرکے رہے گا۔ وہ مزید لکھتا ہے کہ مغرب روحانی حیثیت سے عاری ہے، اس بنا پر وہ کسی ایسی قوم سے طویل جنگ کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا جو مذہب اور مضبوط روحانی یقین کے بل بوتے پر میدانِ عمل میں اُترے۔ (تلخیص انگریزی مضمون، روزنامہ ہندو، ۲۰ ستمبر ۲۰۰۶ء)

یورپ کا بے بنیاد خوف

برطانیہ کے ایک معروف اخبار دی گارڈین (۱۱ اکتوبر ۲۰۰۷ء) میں شائع ہونے والی ایک رپورٹ میں یہ بتایا گیا ہے کہ یورپ میں جو مسلمان آباد ہیں' ان میں اپنے دین سے وابستگی کا رجحان بڑھ رہا ہے۔ اس کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ ان میں دینی شعور بیدار ہو رہا ہے اور اپنے دین پر عمل کرنے کا جذبہ پروان چڑھ رہا ہے۔

دین اسلام کی تعلیم کا نچوڑ یہ ہے کہ وہ یہ بتاتا ہے کہ انسان حادثاتی طور پر اس دنیا میں نہیں آ گیا ہے' بلکہ وہ یہاں بھیجا گیا ہے۔ اس کی اصل حیثیت بندے کی ہے اور اسے اس دنیا میں اپنے رب کا' اپنے پالنہار کا بندہ بن کر رہنا ہے۔ اسے اپنی ساری عمر اس کی بندگی میں گزارنی ہے۔

اسلام کی دوسری تعلیم یہ ہے کہ انسان کو خود ہی رب کا بندہ نہیں بن کر رہنا ہے' بلکہ تمام انسانوں کو اللہ کی بندگی کی طرف بلانا ہے۔ اس کے آگے سجدہ ریز ہونے کی دعوت دینی ہے۔ یوں تو اللہ کا بندہ کہیں بھی اپنے رب کے آگے جھک سکتا ہے اور سجدہ ریز ہوسکتا ہے لیکن اس کے لیے بعض مقامات مخصوص کر لیے گئے ہیں جنھیں مسجد کہا جاتا ہے۔ یہ مسجدیں اس کی مظہر ہیں کہ یہاں رب کے آگے اس کے بندے سجدہ ریز ہوتے ہیں۔ مسلمانوں کی تہذیب و معاشرت میں مسجد کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔ یہ مسجد اسے بندگی رب کی طرف بلاتی ہے۔ اس کے اندر یہ احساس پیدا کرتی ہے کہ اسے اپنے رب کا بندہ بن کر رہنا چاہیے۔ اس لیے اس کو ایک محور کی حیثیت حاصل ہے۔

اس رپورٹ میں یہ بتایا گیا ہے کہ یورپ میں مساجد کی تعمیر کا رجحان بڑھ رہا ہے۔ اگرچہ یہ رپورٹ بھی عالمی خبررساں ایجنسیوں کی دوسری رپورٹوں کی طرح ایک منفی رپورٹ ہے اور

اس میں ایک منفی تصویر ہی پیش کی گئی ہے، تاہم اس سے یورپ میں آباد مسلمانوں کے رجحان کا پتا چلتا ہے، اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہاں مسلمانوں کی آبادی میں اضافہ ہو رہا ہے۔ ظاہر ہے اس میں یہ تو نہیں بتایا گیا ہے کہ یورپ میں مسلمانوں کی آبادی بڑھ رہی ہے، تاہم اس کو چھپانا بھی مشکل ہے۔

ویسے تو یہ رپورٹ سوئٹزرلینڈ سے تعلق رکھتی ہے اور اس میں اس کے ایک چھوٹے سے قصبے وانگن کی ایک مخصوص صورت حال اور کیفیت کا تذکرہ ہے، تاہم نامہ نگار ایان ٹریئز یہ بھی بتاتا ہے کہ جس مخصوص صورت حال کا اس نے تذکرہ کیا ہے، یورپ کے دوسرے ممالک بھی اس کیفیت سے گزر رہے ہیں۔ ان میں اٹلی، آسٹریا، جرمنی اور ہالینڈ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

اس رپورٹ سے یہ بھی ظاہر ہو رہا ہے کہ یورپ میں اسلام کو سمجھنے کی کوششیں بھی ہو رہی ہیں۔ اس کے نتیجے میں دونوں قسم کے ردعمل سامنے آ رہے ہیں۔ کچھ اس کی مخالفت کر رہے ہیں تو کچھ کو اس کی موافقت کی توفیق بھی مل رہی ہے۔ یہاں تک کہ قبولیتِ اسلام کے واقعات بھی درج کیے جا رہے ہیں، اور یہ دونوں ردعمل شعوری طور پر ہو رہے ہیں۔

نامہ نگار نے سوئٹزرلینڈ کے ایک چھوٹے سے قصبے کی ایک مخصوص صورت حال کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ بتایا ہے کہ ۲۱ویں صدی ایک انداز میں یہاں نمودار ہو رہی ہے۔ اس نے اس کو خطرے کی علامت قرار دیا ہے۔ وہ یہ بتاتا ہے کہ یہاں ترک تارکینِ وطن کی ایک چھوٹی سی آبادی کافی عرصے سے مقیم ہے۔ انھوں نے ایک انجمن بھی بنا رکھی ہے۔ یہاں کے مسلمان ایک مکان کے نیچے کے حصے میں پنج وقتہ نماز اور نمازِ جمعہ ادا کرتے چلے آ رہے ہیں۔ وہ اس کو باقاعدہ مسجد کی شکل دینے کے لیے بھی برسوں سے کوشاں تھے۔ اس کی قانونی جدوجہد بھی کرتے رہے ہیں۔ یہاں تک کہ ان کا مسئلہ سوئٹزرلینڈ کی سب سے اونچی عدالت، یعنی سپریم کورٹ تک پہنچا اور بالآخر انھیں کامیابی مل گئی۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ انھیں اس عمارت پر ایک مینار بنانے کی اجازت مل جائے۔ برسوں کی جدوجہد کے بعد سپریم کورٹ نے انھیں اس عمارت پر چھے میٹر اُونچا مینار بنانے کی اجازت دے دی ہے۔ اس پر مسلمانوں کو خوشی تو ضرور ہوئی ہے مگر وہ اس کو دوسروں کو چڑانے کا

موضوع نہیں بنانا چاہتے۔ رپورٹ یہ بتاتی ہے کہ اس فیصلے سے وہاں کی عیسائی آبادی کے ایک حلقے میں بے چینی پیدا ہوگئی ہے۔

رپورٹ میں مذکورہ عیسائی حلقے کے احساسات کو عام احساس بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ اس کا کہنا یہ ہے کہ یورپ میں مساجد کی تعداد میں اضافے کو خطرے کی علامت تصور کیا جا رہا ہے۔ اس قصبے کے ایک باشندے رولینڈ کسلنگ کا یہ احساس نامہ نگار نے قلم بند کیا ہے کہ چھوٹے قصبوں کے لیے تو یہ مساجد کوئی مسئلہ نہیں لیکن شہری آبادی میں ان کی وجہ سے مسائل پیدا ہوں گے۔ کس طرح کے مسائل پیدا ہوں گے؟ اس کی وضاحت یا تو اس نے نہیں کی، یا نامہ نگار نے اس کے حوالے سے یہ بتانا مناسب نہیں سمجھا، تاہم اس نے دائیں بازو کی ایک سیاسی پارٹی سوئس پیپلز پارٹی (ایس وی پی) کے ایک ممبر پارلیمنٹ الرخ شولر کے اس مسئلے پر احساسات کو اپنی رپورٹ کا نہ صرف حصّہ بنایا ہے، بلکہ اس کو اس مسئلے پر یورپ کے عام رجحان کے طور پر پیش کیا ہے۔

رپورٹ کے مطابق مذکورہ پارٹی ملک کی سب سے بڑی اور طاقت ور سیاسی پارٹی ہے اور اس کی کوشش یہ ہے کہ سوئٹزرلینڈ کی ایک عیسائی ملک کی حیثیت کو بحال رکھا جائے۔ اس کے خیال میں اس پر عیسائی تہذیب و ثقافت کا ہی غلبہ ہونا چاہیے۔ یورپ کی سرزمین پر وہ کسی دوسری تہذیب و ثقافت کو پھلتا پھولتا ہوا ہرگز نہیں دیکھ سکتی۔

نامہ نگار نے آگے جو بات لکھی ہے، وہ یہ بتا رہی ہے کہ الرخ شولر کی مخالفت ایک سوچی سمجھی مخالفت ہے۔ وہ ناواقفیت یا نادانی پر مبنی نہیں ہے کیونکہ شولر کے الفاظ میں اسلام محض ایک مذہب نہیں، بلکہ وہ ایک نظریۂ حیات ہے، ایک طریقۂ زندگی ہے جس کا اپنا ایک نظامِ قانون ہے جس کو شریعت کہتے ہیں اور یہ ایک بہت بڑا خطرہ ہے۔ لہٰذا اس کا مقابلہ کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر یہ کام سیاست دانوں نے نہیں کیا تو عوام کریں گے۔ ان کا کہنا ہے کہ انھیں مساجد سے کوئی تعرض نہیں ہے لیکن مینار ہرگز برداشت نہیں کیا جاسکتا کیونکہ یہ ایک سیاسی قوت کی علامت ہے۔ اور یورپ میں کوئی دوسری سیاسی قوت اُبھرے اور اس کو عروج حاصل ہو، یہ ناقابلِ برداشت ہے۔ اس لیے انھوں نے عدالت میں ایک درخواست دائر کی ہے جس میں یہ کہا گیا ہے کہ سوئٹزرلینڈ میں

دستور کی رو سے میناروں کی تعمیر کو ممنوع قرار دیا جائے۔

نامہ نگار یہ بتاتا ہے کہ آسٹریا میں بھی دائیں بازو کی انتہاپسند جماعت کے لیڈر، جورگ ہیدر نے بھی ریڈیکل اسلام کا راستہ روکنے کے بندوبست شروع کر دیے ہیں اور مغربی کلچر کو اس کی زد سے محفوظ رکھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہی حال اٹلی کا ہے جہاں دائیں بازو کی ایک انتہاپسند جماعت ناردرن لیگ نے مسلمانوں کے خلاف محاذ کھول رکھا ہے۔ اس کی اس شدید مخالفت کی وجہ سے بولونا اور جے نوا کے میئروں نے مساجد کی تعمیر کی اجازت دینے سے انکار کر دیا ہے۔ جرمنی اور ہالینڈ میں بھی مساجد کو ایک زبردست خطرہ محسوس کیا جا رہا ہے۔

یورپ کو دراصل یہ خوف لاحق ہے، یا نہایت ہوشیاری سے یہ باور کرایا جا رہا ہے کہ اگر اسلام کا راستہ نہیں روکا گیا اور اس کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کو چیک نہیں کیا گیا تو اس کی بالادستی چھن جائے گی۔ حالانکہ یورپی باشندوں اور دانش وروں کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ اسلام نسل پرستی کی دعوت نہیں دیتا، نہ یہ قوم پرستی کی تعلیم دیتا ہے۔ اس کی دعوت کسی گروہ کی طرف بھی نہیں ہے، بلکہ وہ تو نظریے کی طرف بلاتا ہے۔ ایک اللہ کی طرف اس کی پکار ہے جو تمام انسانوں کا رب ہے۔ اس لحاظ سے یہ انسانیت کی دعوت ہے۔ اس لیے یورپ کو خوف کھانے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ اسے تو معقولیت پسندی سے کام لیتے ہوئے عقل و خرد کی روشنی میں جائزہ لینا چاہیے اور صحیح اور غلط کا فیصلہ کرنا چاہیے۔ (سہ روزہ دعوت، ۲۲ اکتوبر ۲۰۰۷ء)

ترجمان القرآن کا اشاریہ (جنوری ۲۰۰۷ء-دسمبر ۲۰۰۷ء) جنوری ۲۰۰۸ء میں دستیاب ہوگا۔ خواہش مند قارئین رابطہ کر کے طلب کر سکتے ہیں۔ (ادارہ)

قبولِ اسلام کا عالمی رجحان

مخالف میڈیا کے باوجود اسلام کا مغربی مداحوں کا حلقہ وسیع ہو رہا ہے۔ ایک ایسے وقت میں، جب کہ برطانوی اور کیتھولک چرچ کے درمیان خلیج گہری ہو رہی ہے، اہلِ برطانیہ کی اتنی بڑی تعداد، جس کی پہلے کوئی نظیر نہیں، جس میں زیادہ تر خواتین ہیں، اسلام قبول کر رہی ہے۔ اس قدر کثیر تعداد میں قبولِ اسلام کی وجہ سے یہ پیشن گوئی ہو رہی ہے کہ اسلام بہت جلد اس ملک میں ایک اہم مذہبی قوت بن جائے گا۔[1] روز کینڈرک، ہل کمپری ہینسو میں مذہبی تدریس کرنے کے ساتھ ساتھ قرآن کے حوالے سے ایک درسی کتاب کی مصنفہ بھی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ آنے والے ۲۰ سال کے اندر برطانوی نومسلموں کی تعداد اُن مسلمان تارکینِ وطن کے برابر ہو جائے گی یا اُس سے بڑھ جائے گی جو اس مذہب کو برطانیہ میں لے کر آئے ہیں۔

وہ کہتی ہیں کہ اسلام رومن کیتھولک مذہب کی طرح ایک عالمی مذہب ہے کیونکہ دنیا کی کوئی خاص قوم یہ دعویٰ نہیں کرتی کہ یہ صرف اسی کا ہے۔ اسلام آج بڑی تیزی سے امریکا اور یورپ میں بھی پھیل رہا ہے۔ مغربی میڈیا میں اسلام کے حوالے سے منفی تاثر کے باوجود اسلام کی قبولیت بڑھی ہے۔ سلمان رشدی، خلیجی جنگ اور بوسنیا کے مسلمانوں کی حالت زار جیسے واقعات کا چرچا ہونے کے بعد اسلام قبول کرنے کی رفتار میں نمایاں اضافہ ہوا ہے۔[2]

حیران کن بات یہ ہے کہ مغرب کے اندر اس تاثر کے باوجود کہ اسلام میں عورتوں کے ساتھ اچھا سلوک روا نہیں رکھا جاتا ہے، برطانیہ میں اسلام قبول کرنے والوں میں زیادہ تعداد عورتوں کی ہے۔ امریکا میں بھی عورتیں اسلام قبول کرنے کے حوالے سے مردوں پر چار، ایک کی نسبت سے سبقت رکھتی ہیں، جب کہ برطانیہ کی ۱۵ لاکھ مسلمانوں کی آبادی میں ۱۰ ہزار سے ۲۰ ہزار افراد

اسلام قبول کرنے والوں میں بیش تر تعداد خواتین کی ہے۔ برطانیہ کے ان نومسلموں میں زیادہ تر متوسط طبقے کا پس منظر رکھتے ہیں۔ ان میں میتھیو ویلکنسن (مشہور تعلیمی ادارے Eton کا نمایاں طالب علم جو کیمبرج تک گیا) اور لارڈ جسٹس اسکاٹ ('عراق کے لیے اسلحہ' کمیٹی کے سربراہ) کا بیٹا اور بیٹی بھی شامل ہیں۔

اسلامک فاؤنڈیشن لسٹر کے زیراہتمام محدود پیمانے پر کیے گئے سروے سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ زیادہ تر نومسلموں کی عمریں ۳۰ سال سے ۵۰ سال کے درمیان ہیں۔ نوجوان نومسلموں میں زیادہ تعداد طلبہ کی ہے جو علمی لحاظ سے اسلام کی اہمیت کو واضح کرتی ہے۔

امریکی نژاد ماہر نفسیات عالیہ ہیری جو کہ ۱۵ سال قبل اسلام لائیں، کہتی ہیں: کبھی کہا گیا تھا کہ: ''اسلام کی روشنی مغرب سے پھیلے گی''۔ اور آج ہمارے دور میں یہ بات سچ بن کر سامنے آرہی ہے۔ عالیہ ہیری برطانیہ کی اسلام پر ایک مشہور مقررہ ہونے کے ساتھ ساتھ زہرہ انسٹی ٹیوٹ کے ساتھ جو مذہبی لٹریچر شائع کرتا ہے، بطور مشیر کام کررہی ہیں۔ وہ کہتی ہیں: مغربی نومسلم مشرق کی تمام عادات کے بغیر اور اُن سب چیزوں سے پرہیز کے ساتھ جو ثقافتی لحاظ سے غلط ہیں، صاف ذہن لے کر اسلام میں آرہے ہیں۔ آج حقیقی اسلام کی یہ تحریک مغرب میں اپنے آپ کو سب سے طاقت ور محسوس کر رہی ہے۔[۳]

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ تقابل ادیان کی تعلیم میں اضافے کی وجہ سے مذہب کی تبدیلی واقع ہورہی ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ برطانوی میڈیا جو ہر اسلامی چیز کو بُرا بنا کر پیش کرتا ہے وہ بھی ایک وجہ ہے۔ اہلِ مغرب اپنے معاشرے کے اندر جرائم میں اضافہ، خاندان کے ادارے کے توڑ پھوڑ، منشیات اور کثرت شراب نوشی جیسے مسائل[۴] سے بددل ہوکر اسلام کے اندر ایک نظام اور تحفظ کی موجودگی کو بہتر سمجھتے ہیں۔ بہت سارے نومسلم پہلے عیسائی تھے جو چرچ کی غیر یقینی کیفیت کی وجہ سے تذبذب کا شکار تھے اور عقیدۂ تثلیث اور حضرت عیسٰیؑ کی الوہیت کے عقیدے سے بھی ناخوش تھے۔

کچھ نومسلم مذہبی تشخص کی تلاش کو قبولِ اسلام کی وجہ بتاتے ہیں۔ بعض قبولِ اسلام سے قبل مذہب پر عمل کرنے والے عیسائی تھے مگر اُن کی علمی تشنگی صرف اسلام ہی بجھا سکا۔

''میں مذہبی علوم کی طالبہ تھی، تاہم یہ علمی دلیل تھی جس نے مجھے قبولِ اسلام کی راہ دکھائی''۔ روز کینڈرک، جو مذہبی تعلیم کی استاد اور مصنفہ ہے، کہتی ہیں کہ انھیں دراصل گناہ کے تصور پر اعتراض تھا: اسلام میں باپ کے گناہ کے لیے بیٹے کو قصوروار نہیں ٹھیرایا جاتا۔ یہ تصور کہ اللہ ہروقت معاف نہیں کرتا، مسلمانوں کے نزدیک گناہ سمجھا جاتا ہے۔

۳۹ سالہ میمونہ کی پرورش کٹر عیسائی انداز سے ہوئی۔ ۱۵ سال کی عمر میں وہ عیسائی مذہب سے لگاؤ کی بلندیوں کو چھو چکی تھیں۔ اعلیٰ درجے کے گرجے میں عبادت کرتے ہوئے مجھے اس قدر مزہ آتا تھا کہ میں نے عیسائی راہباؤں کی طرح چہرے کو ڈھانپنے کا سوچ لیا۔ پیچیدگی اس وقت شروع ہوئی جب اس کی ایک دعا قبول نہ ہوئی۔ اس نے آنے والے پادریوں پر تو اپنے دروازے بند کردیے، تاہم عیسائی راہباؤں سے بحث ومباحثے کے لیے خانقاہوں میں مسلسل جاتی رہیں۔

وہ کہتی ہیں: میرا عقیدہ پہلے سے زیادہ مضبوط ہوکر واپس آیا، تاہم کسی گرجے، کسی ادارے یا کسی اندھی تقلید کا اب اس میں عمل دخل ختم ہو چکا تھا۔ اسلام قبول کرنے سے قبل انھوں نے ہرعیسائی فرقے، یہودیت اور کرشنا کے افکار وخیالات پر تحقیق کی۔ بہت سارے نومسلم، بندے اور اللہ کے درمیان کسی انسانی واسطے کی موجودگی جیسے عیسائی تصور کو مسترد کرتے ہوئے، مسلمانوں کی اس سوچ کی پُرزور تائید کرتے ہیں کہ انسان اور اللہ کے درمیان براہِ راست تعلّق ہونا چاہیے۔

یہ احساس بھی پایا جاتا ہے کہ برطانیہ کی کلیسا میں رہنمائی کی صلاحیت موجود نہیں اور بہت سارے معاملات میں اُن کی لچک کو شک کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

۲۸ سالہ ہُدیٰ خطاب، جو مسلمان خواتین کے لیے لکھی گئی ایک رہنما کتاب کی مصنفہ ہے، جس کو طٰہٰ نامی ایک اشاعتی ادارے نے اس سال چھاپا ہے، کہتی ہیں: ''مسلمان اپنے اہداف اور مقاصد کو بار بار نہیں بدلتے''۔ ہُدیٰ خطاب ۱۰ برس پہلے یونی ورسٹی میں عربی زبان کی طالبہ تھیں، اسی زمانے میں انھوں نے اسلام قبول کیا۔

عیسائیت تبدیل ہوجاتی ہے، جیسا کہ بعض لوگ یہاں تک بھی کہہ چکے ہیں کہ شادی سے قبل جنسی تعلقات استوار کرنے میں کوئی قباحت نہیں بشرطیکہ یہ تعلّق اُس فرد سے رکھا جائے جس سے آپ کی شادی ہونے والی ہو۔ یہ محض نفسانی خواہشات کی ترجمانی کے علاوہ کچھ نہیں۔ جنسی تعلّق ہو

یا دن میں پانچ وقت کی نماز ہو، اسلام کا موقف اس بارے میں ہمیشہ سے ایک رہا ہے اور اُس میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ نماز ہر وقت آپ کو اللہ تعالیٰ کی یاد دلاتی ہے اور آپ مستقل طور پر اپنی اساس و بنیاد سے وابستہ رہتے ہیں۔ (لکی برنگٹن، دی ٹائمز، لندن geoislam@yahoogroups.com ترجمہ: نور اسلم خان)

حواشی

۱- اسلام اور مسلمانوں کے خلاف میڈیا کی اس کھلی جنگ کی بنیادی وجہ یہی ہے۔ جو کوئی بھی اسلام کو توحید کے اس بنیادی عقیدے کے ساتھ (کہ اللہ ایک اور یکتا ہے، وہی عبادت اور اطاعت کا حقیقی حق دار ہے اور وہی قوانین و ضابطے دینے کا حقیقی ضامن ہے) مانتا ہو، ان سب احکامات کے مجموعے سمیت جو اللہ نے خود متعین کیے ہیں (جو انصاف پر مبنی ہونے کے ساتھ ساتھ مرد و زن کے حقوق و فرائض کو ٹھیک ٹھیک واضح کرتے ہیں) اور ہر شعبۂ زندگی میں اُس کے متعین کردہ انصاف کے پیمانوں (سماجی، معاشی اور سیاسی) انسانوں کے ہر درجے کو چاہے وہ بیویاں ہیں، شوہر ہیں، بچے ہیں، یتیم ہیں، خواتین ہیں، امیر ہیں، غریب ہیں، محتاج ہیں، مسکین ہیں ___ کو فوراً یہ بات سمجھ میں آجاتی ہے کہ آج اسلام کیوں کر مغربی تہذیب اور اُس کے اُن ممتاز اکابر کے لیے ایک خطرہ بنا ہوا ہے جو بے انصافی اور ظلم پر مبنی نظامِ حکومت کو اپنے لیے زیادہ مفید پاتے ہیں۔ لوگوں کے احساسات اور نظریات کو میڈیا (ٹی وی، رسائل، فلموں اور تعلیم) کے ذریعے کنٹرول کرنے کا اختیار بھی انھی لوگوں کے ہاتھ میں ہوتا ہے اور یہ لوگ برتری کے اس فائدے کو محض اس مقصد کے لیے استعمال کرتے ہیں کہ اسلام کے حوالے سے بداعتمادی کی فضا اسی طرح قائم رہے۔

مسلمانوں کو انسانوں کے بنائے ہوئے جھوٹے نظریات اور اعتقادات کے ذریعے نہ تو غلام بنایا جاسکتا ہے اور نہ ان پر اس ذریعے سے حکومت کی جاسکتی ہے، بلکہ اُن پر حکمرانی اور غلامی کا حق صرف اور صرف اللہ کو حاصل ہے۔ یہ اسلام کی روح ہے کہ اللہ کے سوا کسی اور کی غلامی نہیں کی جاسکتی اور اللہ کی ذات سے ہٹ کر نہ تو کسی کے سامنے سر جھکایا جاسکتا ہے اور نہ اُس کی عبادت اللہ کے سوا کی جاسکتی ہے۔

۲- یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ دوسری خلیجی جنگ کے دوران یا اس کے فوراً بعد تقریباً ۵ ہزار امریکی فوجی، جو سعودی عرب میں مقیم رہے، اسلام قبول کر چکے ہیں۔

۳- خواتین کے استحصال کے حوالے سے زیادہ تر الزامات کی بنیادی وجہ وہ مقامی ثقافت ہے جس کی بنیاد ہندو مذہب اور اس سے وابستہ توہمات پر ہے۔ تاہم اس کو یوں پیش کیا جاتا ہے گویا اس کا تعلق اسلام سے ہے۔ اس سے ان افراد کی آزادیِ فکر متاثر ہوتی ہے جو معاملے کو معروضی نقطۂ نظر سے دیکھنے کی کوشش نہیں کرتے۔ بیش تر لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں۔

۴- تفریح اور موج مستی، مغرب کی بڑی صنعتوں میں سے ایک ہے۔ اس لیے بھی ضروری ہے کہ ترقی کے جعلی تصور کو برقرار رکھا جائے کہ حالات چاہے جیسے بھی آئیں، ہمارے لیے اس میں بہتری ہے اور ہمیں مشکلات کے باوجود اُس کو برداشت کرنے کی سعی کرنی چاہیے۔ اپنی خوشی اور لذت اور دنیاوی لوازمات کی تلاش لوگوں کے اذہان پر حاوی ہوچکی ہے، جب کہ دوسری طرف لوگ قتل ہو رہے ہیں، ذبح ہو رہے ہیں، عورتوں کی عزتیں لوٹی جارہی ہیں، معصوم بچوں اور نومولودوں کو چاقوؤں اور کلہاڑیوں سے کاٹا جا رہا ہے۔ سرِراہ ملنے والے معصوم لوگوں کو برسرِعام لوٹ کر قتل کیا جاتا ہے۔ بوڑھوں کو نوعمر لڑکے ضربیں مار مار کر موت کی وادیوں میں دھکیل دیتے ہیں، ہزاروں لوگ کثرت منشیات سے مر رہے ہیں۔ کثرت شراب نوشی کی وجہ سے ہزاروں بے گناہ لوگ اپنی زندگیاں تباہ کر رہے ہیں۔ بہت سارے شراب کے نشے میں مدہوش اپنی بیویوں اور بچوں پر بے دریغ تشدد کر رہے ہیں۔ اور یہ ایک نہ ختم ہونے والی فہرست ہے۔

تفریح کی صنعت ان مؤثر ذرائع میں سے ہے جو غوروفکر کو معمول پر رکھتے ہیں، انسانی ہمدردی کے احساس کو بے حس کر دیتے ہیں اور 'میری خوشی اور مسرت ہی سب سے اہم ہے' کی کیفیت کو بڑھاتے ہیں۔

ادارہ معارف اسلامی کی ایمان افروز پیش کش

قرآن مجید معریٰ

یک رنگ اور دو رنگوں میں
پائیدار، دیدہ زیب جلد کے ساتھ، کمپیوٹر کمپوزنگ، عمدہ کاغذ
مجلد سیپاروں کا سیٹ بھی دستیاب ہے

ہماری کتب

تفہیم احکام القرآن سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ
جلد اول -/350 روپے جلد دوم -/450 روپے

تفہیم الاحادیث (۸ جلدیں)
قیمت مکمل سیٹ -/2994 روپے سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

الاسماء الحسنیٰ
قیمت -/80 روپے سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ

ارمغانِ مودودیؒ (مجموعہ مضامین)
قیمت -/500 روپے جمع و ترتیب: ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، سلیم منصور خالد

اقضیۃ الرسولﷺ (حضور اکرمؐ کے عدالتی فیصلے)
قیمت -/400 روپے امام ابن الطلاع الاندلسی

تاریخ جماعت اسلامی (دو جلدیں)
قیمت -/330 روپے آباد شاہ پوریؒ

جماعت اسلامی کی دستوری جدوجہد
قیمت -/135 روپے میاں طفیل محمد

حکمت عملی کا تسلسل (شوریٰ کے اجلاسوں سے خطابات)
قیمت -/140 روپے قاضی حسین احمد

اسیرانِ روشن خیالی (نئی تصنیف)
قیمت -/70 روپے حافظ محمد ادریس

جدید نظریات کی ناکامی اور اسلام کا روشن مستقبل
قیمت -/88 روپے ڈاکٹر احمد سجاد (بھارت)

مولانا مودودیؒ کی نثر نگاری
قیمت -/120 روپے ڈاکٹر امتیاز احمد

قائداعظم کا نظریہ پاکستان: اسلامی یا سیکولر
قیمت -/15 روپے (فی سیکڑہ -/650) فیض احمد شہابی

رسائل و مسائل (ہشتم)
قیمت -/210 روپے مولانا عبدالمالک

سیرت مصطفیٰ کی کرنیں حافظ محمد ادریس
قیمت -/10 روپے (فی سیکڑہ -/500)

صدائے رستاخیز قیمت -/275 روپے، بانگ سحر قیمت -/235 روپے، آفتاب تازہ قیمت -/245 روپے، جلوۂ نور قیمت -/135 روپے از قلم مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

ملنے کا پتا
مکتبہ معارف اسلامی منصورہ، لاہور
پوسٹ کوڈ 54790 فون: 4-5432476-5432419-5419520

ادارہ معارف اسلامی

اخبارِ اُمت

مصری ججوں کا 'عدالتی جہاد'

سلیم منصور خالد

۹ مارچ ۲۰۰۷ء کو پاکستان میں شروع ہونے والے عدالتی انقلاب کے قائد چیف جسٹس افتخار محمد چودھری ہیں' جب کہ مصر میں اس انقلاب کے لیے مدتوں سے جدوجہد جاری ہے۔

۲۱ جون ۲۰۰۷ء کو مصر کے دو جج صاحبان نے اس پیرایے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ جسٹس محمود مکی کے بقول: ''ہمیں جھکانے میں حکومت کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑے گا۔ بلاشبہہ ہمیں معاشی اعتبار سے قتل کیا گیا ہے' مگر ہمیں اس بات کی ذرہ برابر فکر نہیں ہے۔ جب تک لوگوں کے دلوں میں ہماری عزت موجود ہے' اس وقت تک ہمیں کسی بات کی پروا نہیں ہے''۔ جسٹس ہشام بستاوسی بیان دیتے ہیں: ''ہم پر چلائے جانے والے مقدمات کی کوئی اہمیت نہیں ہے' اصل اہمیت تو اس سوال کو حاصل ہے کہ: مصری عوام کو ایک خودمختار عدلیہ' شفاف انتخابات اور قانون کی حکمرانی کب نصیب ہوتی ہے؟ ہماری جدوجہد انھی سوالوں کا جواب حاصل کرنے کے لیے ہے'' —— مصر کے ججز کلب (judges club) کے ان اہم ارکان کے یہ جذبات ججوں کی تحریک کی پوری داستان بیان کر دیتے ہیں جنھیں ۲۰۰۶ء میں برطرف کر دیا گیا تھا۔

مصر میں بڑی اور چھوٹی عدالتوں کے جج حضرات نے ۱۹۳۹ء میں اپنی تنظیم ججز کلب کی رجسٹریشن کرائی تھی۔ پہلے پہل یہ تنظیم محض ایک رسمی سا ادارہ تھی' لیکن ۱۹۶۸ء میں ججز کلب نے آزاد عدلیہ کے ذریعے' شہری آزادیوں کے تحفظ کا مطالبہ کیا۔ درحقیقت مصری جج' جون ۱۹۶۷ء میں اسرائیل کے ہاتھوں مصر کی شکست سے پیدا شدہ سیاسی' سماجی اور معاشی صورت حال سے سخت دل برداشتہ

تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ انھیں خدشہ تھا کہ کہیں واحد حکمران پارٹی 'عرب سوشلسٹ یونین' میں پورا عدالتی نظام جذب ہو کر نہ رہ جائے۔ یہ پہلا موقع تھا جب صدر جمال عبدالناصر کی بدترین آمریت کے مقابلے میں اخوان کے علاوہ کسی دوسری قوت نے آواز بلند کی' جب کہ اخوان المسلمون کی صورت حال یہ تھی کہ حکمرانوں نے اگست ۱۹۶۶ء میں سید قطب کو پھانسی دے دی تھی۔ ہزاروں کارکن پابند سلاسل تھے اور ریاستی دہشت پورے ماحول پر مسلط تھی۔ ججوں کے اسی گروہ نے' ججوں کی یونین کا الیکشن بھی جیت لیا جس کے جواب میں ۱۹۶۹ء میں صدر ناصر نے 'عدلیہ کے قتل عام' کا راستہ منتخب کیا اور چھوٹی بڑی عدالتوں کے ۱۸۹ ججوں کو منصب عدل کی ذمہ داریوں سے برطرف کر دیا۔ تاہم ستمبر ۱۹۷۰ء میں' ناصر کی موت کے بعد' ججوں کی تحریک کے نتیجے میں انورالسادات اور پھر حسنی مبارک نے عدالتی آزادیوں کو کسی حد تک بحال کیا۔

۱۹۸۶ء میں ججز کلب نے 'قومی کانفرنس براے عدل' منعقد کی، جس نے عدالتی عمل میں دُوررس اثرات کے حامل مطالبے پیش کیے۔ ۱۹۹۱ء میں ججز کلب نے عدالتی عمل کے لیے ایک جامع دستور منظور کیا' لیکن فعال قیادت کی عدم موجودگی کے باعث 'سفارشات واصلاحات عدلیہ' کی تحریک کچھ عرصے کے لیے کمزور پڑ گئی۔ البتہ دسمبر ۲۰۰۴ء میں ایک نئے عزم کے ساتھ ججز کلب نے ۱۹۹۱ء کے عدالتی دستور میں دوٹوک انداز میں ترامیم کر کے' مطالبات کو واضح الفاظ میں بیان کیا تاکہ عدالتی عمل میں سے انتظامیہ کی مداخلت اور اتھارٹی کے دباؤ سے نجات حاصل ہو سکے۔ ۲۰۰۴ء کے اس دستورِ عدل میں کہا گیا ہے:

- عدلیہ کو مکمل مالی خودمختاری دی جائے۔ انھیں بجٹ سازی کا حق دیا جائے تاکہ وہ پارلیمنٹ کے پہلو بہ پہلو ریاست کی ایک مؤثر قوت کے طور پر اپنی ذمہ داری ادا کر سکے۔
- وزارتِ عدل سے عدالتی ذمہ داریوں کا توازن سپریم جوڈیشل کونسل کی طرف منتقل کیا جائے۔ کسی بھی انضباطی مسئلے میں عدالتی ارکان کے مقدمات اور تنازعات کی سماعت کا اختیار اسی عدالتی مقتدرہ کو حاصل ہونا چاہیے۔
- پنشن کے ضوابط میں ترمیم کی جائے اور بوقت ریٹائرمنٹ ججوں کو بے جا کٹوتیوں سے نجات دی جائے' وغیرہ وغیرہ۔

دراصل جج حضرت اس نوعیت کے چارٹر کے ذریعے: عدالتی آزادی کو یقینی بنانے اور حکومت و ریاست کی بے جا مداخلتوں اور فیصلوں پر اثر انداز ہونے کے واقعات کا سدباب چاہتے ہیں۔ ججز کلب بنیادی طور پر نظریاتی فورم نہیں، بلکہ پیشہ ورانہ بنیادوں پر عدالتی اصلاح کے علَم برداروں کی تنظیم اور تحریک ہے۔ مصری آمر جمال ناصر کے پرستار صحافی عبدالحلیم قندیل نے لکھا تھا: ''ججوں کے 'انقلاب' کا مطلب انتظامیہ کی موت ہوتا ہے''۔ اس جملے میں شرارت کا ایک پہلو چھپا ہوا ہے۔ اس حوالے سے مصر کے دانش ور حلقوں میں یہ بات زیر بحث آئی کہ: ''اس تحریک کو ججوں کا انقلاب کہا جائے یا ججوں کی لہر۔ انقلاب ایک سخت لفظ ہے، لیکن لہر ذرا نرم لفظ ہے، اور لہر کے نتیجے میں سیاسی نظام کے تلپٹ ہونے کا تاثر نہیں ملتا''۔ ویسے بھی ججوں کی یہ تحریک، حکومت کے متوازی کسی مقتدرہ کے قیام کی خواہش کا اظہار نہیں ہے، بلکہ ان کی اصلاحات کا محور آئینی اور قانونی اختیارات کے آزادانہ استعمال کا حق حاصل کرنا ہے، جسے مصری آمروں نے زنجیروں میں جکڑ رکھا ہے۔

مصر کا دستور حکومت کو اس چیز کا پابند بناتا ہے کہ تمام انتخابات لازماً عدلیہ کی نگرانی میں ہوں لیکن ججز کلب نے اس شق کی بے حرمتی کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے: ''پورے حلقۂ انتخاب میں بظاہر انتخابی عمل کا نگران ایک جج ہوتا ہے، لیکن انتخاب کے روز نیچے پورا عملہ حکومتی مشینری کا مقرر کیا ہوتا ہے، جس سے جو کام چاہے لیا جاتا ہے۔ جب اور جہاں حکومت، پولیس یا مسلح فوجی دستے چاہتے ہیں، بے بس جج کو مفلوج بنا کر من مانی کرتے اور نتائج کو تلپٹ کر دیتے ہیں اور جج بے چارا صدائے احتجاج بلند کرنے کے حق سے بھی محروم رہتا ہے، چہ جائیکہ وہ اس انتخاب کو منسوخ کرے کہ جس میں انتخاب نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی''۔

ہشام بستاوسی اور محمود مکی، ججز کلب کے دو مرکزی قائدین ہیں، جنھیں عدلیہ کی آزادی کے لیے طویل جدوجہد کا اعزاز حاصل ہے۔ مصری حکومت ان کی بے باکی، حق گوئی اور پُرعزم بہادری سے خائف رہتی تھی۔ ان دونوں حضرات نے نومبر اور دسمبر ۲۰۰۵ء میں منعقد ہونے والے مصری پارلیمانی انتخابات کے انعقاد کے طریقے اور اعلان کردہ نتائج کو تنقید کا نشانہ بنایا، اور کہا: ''حکومت نے قوم سے خیانت کی ہے، دھاندلی کا راستہ کشادہ کیا ہے، عوامی رائے کو دفن کیا ہے، پولنگ اسٹیشن پر جانے والے لوگوں کو پولیس کے دستوں کے ذریعے روکا گیا ہے، اور سادہ کپڑوں میں

ملبوس ایجنسیوں اور عسکری اداروں کے اہل کاروں نے مخالف راے دہندگان کو ڈرا دھمکا کر انتخاب سے دُور رکھا ہے۔ راے عامہ کے اس قتل عام کو انتخاب کہنا عوام کی توہین ہے''۔

ان ججوں کے مذکورہ بیان پر حسنی مبارک حکومت بوکھلاہٹ کا شکار ہوکر دیوانگی پر اتر آئی اور ۱۳ فروری ۲۰۰۶ء کو اس بیان کو 'ججوں کی سرکشی' (judges rebellion) سے موسوم کیا۔ اعلیٰ عدالتی کونسل نے انھیں عدالتی خدمات انجام دینے سے روک دیا۔ حق گو ججوں نے 'کورٹ آف اپیل' میں درخواست دائر کی، تاکہ وہ اپنا موقف وضاحت سے پیش کرسکیں۔

اب یہ ۲۷ اپریل ۲۰۰۶ء کا منظر ہے۔ قاہرہ کے وسط میں ہائی کورٹ کی عمارت ہے، جس کے قرب و جوار میں جج کلب کا دفتر ہے۔ اس روز ججوں کے کیس کی سماعت تھی۔ لوگ اپنے محسن ججوں کے خلاف روا رکھے جانے والے ظالمانہ سلوک کے خلاف سراپا احتجاج تھے۔ رفتہ رفتہ ان کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا اور ۱۰ ہزار پولیس اہل کاروں نے احتجاج کرنے والوں کو گھیرے میں لے لیا۔ مظاہرین کی بڑی تعداد کو گرفتار کرتے ہوئے بے رحمی سے تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ یہیں پر ۸۰ ججوں نے درجنوں حامیوں کے ساتھ ہفتے بھر کے لیے احتجاجی دھرنا دینے کا اعلان کیا اور شاہراہ پر بیٹھ گئے۔ پولیس نے وحشیانہ انداز سے ان قانون دانوں پر چڑھائی کردی، یوں نظر پڑا جیسے حکومتی سیکورٹی عناصر کسی دشمن ملک کی فوج پر پل پڑے ہوں۔ حالانکہ وہ جج تو محض اپنے دو بھائیوں کے ساتھ اظہار یک جہتی کے لیے آئے تھے، ان کے ہاتھ میں نہ پتھر تھے اور نہ ڈنڈے۔

حسنی مبارک حکومت، عدلیہ کی اس تنقید سے جھنجھلاہٹ کا شکار ہوگئی جس کے تحت وہ حکومتی طور طریقوں، حقوق کی پامالی اور بے ضابطگیوں کو زیر بحث لاتے ہیں۔ وہ ملک جہاں ذرائع ابلاغ پر پابندیاں ہیں، حزبِ اختلاف کا گلا گھونٹ دیا گیا ہے، انتخابات میں دھاندلی کو حکومتی حق قرار دے دیا گیا ہے اور مالی خیانت کو جدید مصری انتظامیہ کا استحقاق تسلیم کرایا جا رہا ہے، وہاں پر صرف ایک جگہ رہ جاتی ہے، اور وہ ہیں عدالت کے ایوان، جہاں پر بہادر جج وقتاً فوقتاً اپنے ضمیر کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے فیصلے دیتے ہیں۔ ان کا یہی عمل حکومت کے اعصاب کو شل اور دماغ کو پاگل کیے دیتا ہے۔

دراصل مصر میں صرف عدلیہ ہی وہ ادارہ ہے، جس نے ۶۰ کے عشرے میں کی جانے والی جدوجہد کے نتیجے میں کچھ نہ کچھ خودمختاری حاصل کرلی تھی، جس کا اظہار عدالتی کارروائی اور جج کلب کی سرگرمیوں کی

صورت میں سامنے آتا رہتا ہے۔

۲۱ جون ۲۰۰۷ء کو جوڈیشل کونسل نے ہر دو ججوں کے مقدمے کا فیصلہ سنایا‘ جس میں ہشام بستاوسی کے بارے میں چند سخت جملے لکھے اور محمود مکی کو بری کر دیا گیا۔ اس کے بعد ججوں کی تحریک نے سڑکوں کے بجاے عدالت کی کرسی اور اخبارات کے اوراق کو اپنے موقف کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ مصر میں ججوں کی یہ تحریک بہرطور روشنی کی ایک کرن ہے۔ اخوان المسلمون کے جہاں دیدہ رہنما اور پُرعزم کارکن اس تحریک کے پہلو بہ پہلو کھڑے ہیں۔

اس تحریک کا آغاز ۱۹۶۸ء میں ہوا تھا‘ اور اب ۴۰ برس گزرنے کے باوجود اِن میں کسی مایوسی کا شائبہ تک نہیں پایا جاتا۔ ان ججوں نے کبھی سُست روی سے اور گاہے بہ گاہے برق رفتاری سے حق گوئی اور پُرعزم جدوجہد کا علَم بلند کیے رکھا ہے۔ جسے کچھ لوگ ’عدالتی بغاوت‘ بعض افراد ’عدالتی انتفاضہ‘ اور کچھ حضرات ’عدالتی جہاد‘ کہتے ہیں۔ نام جو بھی دیا جائے‘ بہرحال اس تحریک نے غلامی کے رزق پر عدل کی آزادی کو ترجیح دی ہے۔ ملازمت سے برطرفی‘ ڈنڈوں کی بوچھاڑ اور زخموں کی سوغات سے عدلیہ کی سربلندی اور قوم کی آزادی کا سورج طلوع ہونے کی امید باندھی ہے۔ اس تحریک میں مسلم دنیا پر مسلط موت کے سناٹے اور غلامی کے جال کو توڑنے کا پیغام موجود ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کس ملک کے جج غلامی کے رزق پر آزادی کی آزمایش کو خوشی خوشی قبول کرنے کا راستہ اختیار کرتے ہیں‘ اور ان خالی ہاتھ ججوں کے پشتی بان بننے کا اعزاز کن سیاسی و سماجی قوتوں کو حاصل ہوتا ہے۔ ہمارے ملک میں جاری عدلیہ کی بالادستی کی تحریک اور اس کے لیے سرگرم عناصر کے لیے مصر کے جج کی ’عدالتی جہاد‘ کی یہ تحریک اُمید کی کرن اور روشنی کا پیغام ہے!

رسائل ومسائل

طبی اخلاقیات

سوال: ۱- کیا میڈیکل دواساز کمپنیوں کی رقم سے کوئی ڈاکٹر انفرادی دائرے میں جہاز کا ٹکٹ، گاڑی، نقد رقم، ہوٹل میں قیام کے اخراجات، ان کی گاڑی کا استعمال، بال پوائنٹ یا ان کی دعوتوں سے استفادہ کرسکتا ہے، کیا یہ جائز ہے؟

۲- اجتماعی دائرے میں کارِخیر کے لیے رقم، مریض کے لیے دوا، علمی اجتماعات کا انعقاد، سیمی نار یا علمی و تحقیقی کاموں کے بین الاقوامی پروگرامات میں اسپانسرشپ لی جاسکتی ہے۔

۳- بازار میں ایک ہی دوا مختلف کمپنیوں کی طرف سے مختلف قیمتوں پر دستیاب ہوتی ہے۔ کیا مہنگی دوا لکھی جاسکتی ہے، جب کہ مؤثر سستی دوا موجود ہو۔ کیا اثر انگیزی کی بنا پر مہنگی دوا لکھی جاسکتی ہے۔ اس میں گناہ کا احتمال ہے یا نہیں؟

جواب: قرآن کریم کے ہدایت اور خاتم النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کے اعلیٰ ترین مقام پر فائز ہونے [وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ۝ القلم ۶۸:۴] کا واضح مفہوم یہ ہے کہ زندگی کے مختلف دائروں میں جن کا تعلق چاہے معیشت سے ہو یا معاشرت سے، سیاست سے ہو یا عبادات سے، تعمیراتی منصوبوں سے ہو یا ایک طبیب، استاد یا اہلِ فن کے معاملات کے ساتھ، ہر ہر شعبۂ حیات میں اصولِ اخلاق اور ان کی تطبیق کے لیے رہنمائی پائی جائے۔ اسی بنا پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر ہر مسکراہٹ اور ہر ہر عمل کو اسوۂ حسنہ قرار دے کر، ہمیں یہ دعوت دی گئی کہ آپ کے اسوہ اور قرآن کریم کی تعلیمات کی روشنی میں اپنے روزمرہ کے معاملات کا حل تلاش کیا جائے۔

انسانی جان اور دین کا تحفظ و بقا، دو اوّلین مقاصد شریعہ ہیں اور اس لحاظ سے ایک مسلم طبیب کے لیے نہ صرف جان بلکہ دین کے حوالے سے بھی مناسب معلومات رکھنا ضروری ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ۲۰ویں صدی کی تحریکِ احیاے دین کے زیر اثر سیکڑوں' ہزاروں مسلم اطبّا دنیا کے ہر گوشے میں جدید طبی مسائل کے حوالے سے مشاورت' سیمی نار اور کانفرنسوں کے ذریعے ان مسائل کے حل میں لگے ہوئے ہیں۔ ان کے مسائل حل کرنے کی ذمہ داری نہ صرف علماے کرام کی ہے' بلکہ یکساں طور پر ان مسلم اطبّا کی بھی ہے جو دین کا فہم رکھتے ہوں اور شریعت کے اصولوں سے آگاہی رکھتے ہوں۔ ان مسائل کا دیرپا حل اسی وقت ممکن ہے جب طب کی تعلیم کے دوران ہر مسلم طالب علم کو قرآن وسنت کی تعلیمات سے اتنا آگاہ کر دیا جائے کہ وہ حلال وحرام کے فرق کو خود سمجھ سکے اور قرآن وسنت کے واضح اصولوں کو خود استعمال کرتے ہوئے نئے راستے نکال سکے۔

ان اصولوں میں سے دو بنیادی اصول حفظ نفس اور حفظ دین ہیں۔ لیکن اگر غور کیا جائے تو دین کی بنیاد جن اصولوں پر ہے' وہ ہر مسئلے پر ہماری رہنمائی کرتے ہیں یعنی توحید اور عدل۔

اگر ایک دواساز کمپنی ایک طبیب کو بیرون ملک تفریح کے لیے ٹکٹ' رہایش فراہم کرتی ہے تو ظاہر ہے اس کا مقصد کسی مریض کی فلاح یا کسی علمی تحقیق کے ذریعے انسانیت کی جان بچانا نہیں ہوسکتا۔ اس کا واضح مقصد اس طبیب کو ممنون احسان بنا کر اپنی دوا کی زیادہ فروخت اور شہرت ہی ہوسکتا ہے جو بظاہر رشوت اور شہادتِ زُور سے مماثلت کی بنا پر جائز اور حلال قرار نہیں دیا جاسکتا اور اسلامی شریعت کے واضح احکامات کی خلاف ورزی شمار ہوگا۔ اس لیے وہ بیرون ملک سفر کی سہولت ہو یا ذاتی استعمال کے لیے کار کی فراہمی' نقد رقم یا دیگر سہولیات کی فراہمی' ان میں سے کسی بھی سہولت کو جائز نہیں کہا جاسکتا۔

حد سے حد جس چیز کو گوارا کیا جاسکتا ہے' وہ کسی دواز ساز کمپنی کی طرف سے تقسیم کیے گئے بال پوائنٹ قلم' جس کی بنا پر کوئی طبیب کسی دواساز کمپنی کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتا اور جسے اپنی مالیت اور معاوضہ نہ ہونے کی بنا پر رشوت نہیں کہا جاسکتا۔ اس کی مثال ایسی ہی ہے کہ رمضان المبارک کے آغاز میں بہت سے تجارتی ادارے اوقات سحر وافطار طبع کر کے عام فائدے کے لیے تقسیم کرتے ہیں اور گو اس پر ان کے ادارے کا نام چھپا ہوتا ہے لیکن اصل مقصد عوام الناس کو ایک سہولت دینا ہے اور محض اس بنا پر کوئی ان کی دکان سے اشیا نہیں خریدتا۔

سوال کا دوسرا پہلو اجتماعی فوائد یا مصالح عامہ سے ہے' یعنی اگر ایک دواساز کمپنی ایک تعلیمی

ادارے کو ایک بڑی رقم اس غرض سے دیتی ہے کہ کسی مہلک مرض کے علاج کے لیے تحقیق کروائی جائے اور اس غرض سے محققین کی ایک ٹیم کی تنخواہیں، یا لیبارٹری کا قیام، یا ایک سائنسی سیمی نار کے انعقاد کے ذریعے اس مرض کے علاج کے راستے دریافت کیے جائیں تو اس صورت میں یہ رقم نہ تو رشوت شمار ہوگی اور نہ اس کی بنا پر محققین شہادتِ زور کے مرتکب ہوں گے۔ ہاں اگر ان محققین کو اس غرض سے رکھا جائے کہ وہ کمپنی کی تیار کردہ کسی دوا کی تعریف و تحسین کریں اور نتائج میں یہ بات دکھائیں کہ یہ دوا دیگر ادویات کے مقابلے میں زیادہ مفید ہے جب کہ حقیقتِ واقعہ یہ نہ ہو تو اس کا یہ عمل اسلامی اصولوں کے منافی اور رشوت اور شہادتِ زور کی تعریف میں آئے گا۔ یہاں معاملہ محض نیت کا نہیں ہے، بلکہ ہر دو جانب سے شفاف طور پر تحقیق کی نوعیت اور مقاصد کا ہے۔

اگر ایک دواساز کمپنی اپنے منافع کا ۱۰ فی صد حصہ صرف اس کام کے لیے مخصوص کرتی ہے کہ وہ کسی خاص مرض یا کسی خاص دوا کی اثرانگیزی پر تحقیق کرائے گی اس سے قطع نظر کہ وہ دوا اس کی اپنی ساختہ ہو یا محض کیمیائی طور پر تیار کی گئی ہو تو اس رقم کا استعمال مصلحت عامہ کے اصول کی بنا پر جائز اور حلال ہوگا۔ لیکن اگر وہ مشروط طور پر یہ کام کرائے، یا اس کا اصل مقصد یہ ہو کہ اس کی دوا دوسروں کے مقابلے میں برتر ثابت کی جائے جب کہ دیگر ادویات بھی ویسی ہی اثرانگیزی رکھتی ہوں تو یہ ایک ناجائز اور غیراخلاقی کام ہوگا جس کی اسلامی شریعت میں کوئی گنجایش نہیں۔

شریعت ایک عمل کے حرام یا حلال ہونے کے ساتھ اُس عمل کے طریقے کو بھی یکساں اہمیّت دیتی ہے اور حصولِ مقصد کے لیے جو ذرائع استعمال کیے جائیں، وہ بھی اخلاقی اور قانونی لحاظ سے معروف اور بھلائی پر مبنی ہونے چاہییں۔ کسی کام کے لیے اچھی نیت کے بعد اگر ذریعہ منکر اختیار کیا جائے تو وہ کام اچھا نہیں بن سکتا، اس لیے طبی اخلاقیات میں بھی ہمیں مقصد اور ذرائع دونوں کو اخلاق کا تابع بنانا ہوگا۔

مصلحت عامہ کے لیے کسی ادارے سے غیرمشروط طور پر امداد لے کر علمی اجتماعات کا منعقد کرنا، یا مریضوں کے لیے اُس رقم سے ادویات حاصل کر کے نادار افراد کی مدد کرنا، یا ان کی طبی سہولت کے لیے اس رقم سے ایمبولینس خریدنا وغیرہ مقصد اور ذریعہ دونوں کے پیش نظر حرام نہیں قرار دیا جاسکتا۔ اگر کوئی ادارہ اس قسم کی کسی امداد کے بغیر خود اپنے وسائل سے کام کرسکتا ہے تو لازماً یہ افضل

ہے لیکن اگر غیر مشروط طور پر کوئی دواساز کمپنی کسی اجتماعی رفاہی کام کے لیے کوئی رقم مخصوص کرتی ہے اور اس کے نتیجے میں وہ کسی بدلے کی توقع نہیں کرتی تو اس میں اخلاقی طور پر کوئی قباحت نظر نہیں آتی۔

بازار میں ایک ہی نسخے سے تیار کردہ مختلف ناموں سے پائی جانے والی ادویات میں بعض اوقات تو کسی ایک عنصر کے تناسب یا اضافے کی بنا پر، اگر وہ اضافہ کرنا طبی طور پر ضروری ہو، دوا کی قیمت میں فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ حقیقی بھی ہوسکتا ہے اور مصنوعی بھی۔ لیکن اگر اجزا ایک ہیں اور کمپنی کی شہرت کی بنا پر وہ اپنی شہرت کی قیمت وصول کر رہی ہے تو ایک مسلم طبیب کا فرض بنتا ہے کہ وہ اپنے مریض کا مفاد دیکھے یعنی یہ کہ اس کی صحت اور جان کے تحفظ کے لیے کون سی دوا زیادہ بہتر ہے، چاہے اس کی قیمت دوسری دوا سے ۵۰ فی صد کم ہی کیوں نہ ہو۔

بعض اطبا کا یہ خیال کہ اگر وہ مریض کو ایک مہنگی دوا دیں گے تو نفسیاتی طور پر وہ زیادہ مطمئن ہوگا، یہ ایک غیر اخلاقی فعل ہے۔ دوا کے اجزا اگر یکساں ہوں تو لازمی طور پر ایک کم قیمت دوا کا لکھنا افضل ہے۔ شریعت کا معروف اصول حفظِ مال کا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ کسی مسلمان کے مال کو ناجائز طور پر نقصان نہ پہنچایا جائے۔ ایک طبیب یہ جانتے ہوئے کہ ایک اینٹی بائیوٹک کم قیمت ہے اور ایک محض کسی کمپنی کی شہرت کی بنا پر اس سے ۷۰ فی صد زیادہ مہنگی ہے، اگر مہنگی دوا تجویز کرتا ہے تو یہ مریض کے مال کو نقصان پہنچانا ہے اور مقاصدِ شریعت سے ٹکراتا ہے۔ ہاں یہ یقین کرنے کی ضرورت ہوگی کہ ایک کم قیمت دوا کے اجزاے عنصری وہی ہوں جو مرض کی اصلاح کے لیے ضروری ہیں۔

اگر تحقیق سے یہ بات معلوم ہو کہ ایک دوا اپنی اثر انگیزی میں دوسری کے مقابلے میں زیادہ مؤثر ہوگی لیکن قیمتاً مہنگی ہے، جب کہ دوسری قیمتاً کم ہے اور اثر انگیزی میں بھی کم ہے تو طبیب کو فقہی اجتہاد کرنا ہوگا کہ کیا مرض کی نوعیت سرعت کے ساتھ علاج کی متقاضی ہے، یا ایک ہلکا اثر کرنے والی دوا بجاے دو دن میں اثر دکھانے کے تین دن میں اثر دکھا دے گی اور اس سے مریض کو کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ یہ اس کا اجتہاد محض اپنے طبی تجربے کی بنیاد پر ہوگا اور ایسا کرتے وقت وہ اللہ کو حاضر جان کر یہ طے کرے گا کہ کون سی دوا تجویز کرے۔ دراصل ہر طبی راے ایک ذمہ دار اور اجتہادی راے کا مقام رکھتی ہے اور ایک مسلم طبیب کو شریعت کے بنیادی اصولوں سے اتنا آگاہ ہونا چاہیے کہ وہ اپنے ضمیر اور علم کی بنیاد پر موقع ہی پر اس طرح کے اجتہادی فیصلے کر سکے۔ (ڈاکٹر انیس احمد)

بدکار شوہر کے ساتھ زندگی

س: میں ایک مخدوم (پیر) گھرانے میں بیاہی گئی جس کی عزت اور شرافت کے ڈنکے بجائے جاتے ہیں۔ نیک نامی کا سہرا پشتوں سے سر پر سجا آرہا ہے مگر ان کے مردوں کے طور اطوار اپنی بیویوں کے لیے غیر مہذب اور ظالمانہ ہیں۔ گھر سے باہر اور گھر کے اندر، دوسروں کے لیے اور بیوی کے لیے علیحدہ علیحدہ چہرے ہیں۔ انتہائی گھناؤنے کردار کے مالک یہ مرد کتنی عورتوں کی عصمتوں پہ ڈاکے ڈالتے ہیں مگر گھر کی عورتیں ایک معمول کا کام سمجھ کر خاموش رہتی ہیں، بلکہ خاموش رکھی جاتی ہیں۔ نسل در نسل یہ ظلم کا کھیل جاری ہے۔ ان کی دیکھا دیکھی عام گھرانوں میں بھی یہ سلسلہ چل نکلا ہے جہاں جذباتی صدمے عورت کا مقدر ہیں۔ گھر کے کسی فرد سے کچھ دادرسی کی کوشش کرو تو 'مرد ایسے کرتے ہی ہیں' کہہ کر نظرانداز کر دیا جاتا ہے۔ کیا مادی ضروریات پوری کر کے عورت کے حقوق پورے ہو جاتے ہیں؟ میں اسلامی معاشرے میں مرد کی ذمہ داریاں بحیثیت شوہر اور عورت کے حقوق کے بارے میں جانتی ہوں بلکہ سب جانتے ہیں مگر یہ حقوق و فرائض کیا صرف کتابوں تک محدود ہیں۔

کیا مرد کا یہ فلسفہ قابلِ قبول ہے کہ گھر کے باہر کا وقت اس کا اپنا ہوتا ہے، جو چاہے کرے، جہاں چاہے جائے؟ کیا یہ نکاح کے معاہدے کی خلاف ورزی اور خیانت نہیں؟ کیا رنگین مزاجی کسی مرد کی ایسی عادت ہے کہ وہ اس سے عمر کے کسی حصّے میں بھی چھٹکارا نہ پاسکے؟ اس کو فطرت کا حصّہ سمجھ کر خود کو معذور جانے کہ چھٹکارا مشکل ہے؟

اسلام خاندانی نظام کو مضبوط دیکھنا چاہتا ہے۔ مصائب دنیا کے بعد آخرت میں کامیابی ہو جائے تو بُرا سودا نہیں۔ اچھی امید پر میں نے ایک مدت گزاری ہے مگر اب میری ہمت جواب دے گئی ہے۔ شادی کے ۳۰ سال بعد بھی ایک باوفا، نیک نیت بیوی کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔ زبان اور ہاتھ کے رویے، جذباتی صدمے، کیا کچھ میں نے برداشت نہیں کیا۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے دی۔ دوسروں کے استفسار پر پردہ پوشی کی۔ بچوں

کے باپ ہونے اور شوہر ہونے کی لاج رکھی۔ ان کی وجہ سے بچوں کے رشتوں میں کتنی مشکل اٹھائی۔ ان کے رویے اور کردار سے معاشرے میں میری بھی رسوائی ہوئی۔ میں نے سب اچھی امید اور بڑھاپے میں تو سکون ہوگا' کی توقع کے ساتھ برداشت کیا۔ اب میں کہاں کھڑی ہوں؟ اللہ سے تو ان شاء اللہ اجر کی پوری امید ہے ___ کیا اب خلع لوں؟ عورت کی دادرسی کے لیے قرآن وحدیث کے حوالے سے رہنمائی دیجیے۔

ج: ظلم بھری داستان پڑھ کر صدمہ ہوا۔ جس خاندان کو دین کے نام پر عزت ملی ہو اس کی طرف سے دین کی حرمت پامال کی جائے' عصمت وعفت کی چادر کو تار تار کردیا جائے' اپنے گھر والوں کی عزتِ نفس اور حقوق پامال کیے جائیں' یہ تو دوہرا ظلم ہے۔

نکاح کا مقصد نسلِ انسانی کو پھیلانے میں اپنے حصّے کا فرض ادا کرنا ہے۔ نکاح کے ذریعے عصمت وعفت کا سامان ہوتا ہے اور خاندانی نظام وجود میں آتا ہے جو محبتوں کے حصار کی حیثیت رکھتا ہے۔ ماں باپ' دادادادی' نانا نانی' بیٹا بیٹی' پوتا پوتی' نواسا نواسی' بہن بھائی' چچا تایا' ماموں' خالہ' پھوپھی وغیرہ خاندانی رشتے' سب محبت کے رشتے ہیں۔ ان رشتوں کے ذریعے انسان کو سکون اور راحت ملتی ہے اور وہ اپنے آپ کو محفوظ و مامون سمجھتا ہے۔ ان سب رشتوں کی اساس میاں بیوی کا رشتہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّ خَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَ بَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّ نِسَآءً ۚ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَ الْاَرْحَامَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا۝ (النساء ۴:۱) اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا اور اُسی جان سے اس کا جوڑا بنایا اور ان دونوں سے بہت مرد و عورت دنیا میں پھیلا دیے۔ اُس خدا سے ڈرو جس کا واسطہ دے کر تم ایک دوسرے سے اپنے حق مانگتے ہو اور رشتہ و قرابت کے تعلقات کو بگاڑنے سے پرہیز کرو۔ یقین جانو کہ اللہ تم پر نگرانی کر رہا ہے۔

یہ خاندانی نظام اور رشتے اسی وقت قائم رہ سکتے ہیں' جب کہ نکاح مرد اور عورت دونوں کو پاک باز بنا دے۔ عفت و عصمت عورت ہی کے لیے نہیں' بلکہ مرد کے لیے بھی ضروری ہے۔ مرد

اگر رنگین مزاج ہو، آوارہ عورتوں کو کھلاتا پلاتا اور ان کے ذریعے شہوت کی تسکین کرتا ہو تو اس کے نتیجے میں جو بچے پیدا ہوں گے، ان کی ماں تو ہوگی لیکن باپ نہ ہوگا۔

نکاح سے پہلے اگر کوئی بالغ مرد اور بالغ عورت زنا کی مرتکب ہو تو اس کی سزا ۱۰۰ کوڑے ہیں، اور نکاح اور شادی کے بعد کوئی اس کا ارتکاب کرے تو اس کی سزا سنگساری ہے۔ جو مرد نکاح کے بعد رنگین مزاجی کا مظاہرہ کرتا ہے، وہ درحقیقت اپنی بیوی کی عزت و حرمت اور جذبات کو بھی پامال کرتا ہے۔ اسی لیے اسلام میں اس کے لیے کڑی سزا رکھی گئی ہے۔ اگر اس کے خلاف زنا کے چار چشم دید گواہ موجود ہوں، یا وہ اس کا اقرار کرے تو اس کی سزا رجم ہے، اور اگر چار عینی گواہ یا اقرار نہ ہو لیکن ایک دو گواہ موجود ہوں، یا قرائن موجود ہوں، تو عدالت اسے تعزیری سزا دے گی اور کوڑے لگائے گی۔ اگر یہ قانون نافذ العمل ہو اور حکومت ایسے ہاتھوں میں ہو جو اس قانون کو نافذ کرنے والے ہوں تو پھر خواتین پر نام نہاد شرفا ظلم نہ کرسکیں۔

آپ جیسی مظلوم خواتین کو موجودہ قانون، قانون نافذ کرنے والے، حکومت اور عدالتیں تو انصاف فراہم نہیں کرسکتیں۔ رہی سوسائٹی تو وہ بھی بقول آپ کے ظالم مردوں کے ظلم کے لیے تاویلیں تلاش کرتی ہے، لیکن وہ بری الذمہ نہیں ہوسکتی۔ شرفا کو چاہیے کہ اپنے خاندان کے رنگین مزاجوں کو نصیحت اور تنبیہہ کے ذریعے راہِ راست پر لائیں، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کریں، انھیں آخرت کے عذاب سے ڈرائیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے معراج کے موقع پر زنا کار مردوں اور عورتوں کے ہولناک مناظر دیکھے۔ آپؐ نے دیکھا کہ ایک تنور ہے جس میں مرد اور عورتیں ہیں۔ جب آگ کے شعلے اُوپر کو اُٹھتے ہیں تو یہ اوپر آجاتے ہیں، اور جب شعلے نیچے چلے جاتے ہیں تو یہ مرد و عورت بھی تنور میں نیچے چلے جاتے ہیں۔ جبرئیلؑ سے آپؐ نے پوچھا کہ یہ مرد اور عورتیں کون ہیں؟ جبرئیلؑ نے جواب دیا کہ زنا کار مرد اور عورتیں ہیں۔ (بخاری)

آخرت کے عذاب سے ڈرانا اور اصلاح کرنا فرض ہے۔ جس معاشرے میں یہ کام نہ ہو، لوگ آزادی سے گناہ کے مرتکب ہوں، مجرم اور خاموش معاشرہ دونوں پر عذاب کا خطرہ ہوتا ہے۔ اسلام ایسا معاشرہ تشکیل دیتا ہے جس میں مجرم کو قانون کی گرفت میں آنے اور معاشرے میں ذلیل و رسوا ہوجانے کا خدشہ ہو۔ اسے احساس ہو کہ اگر قانون کی تلوار سے بچ گیا تو معاشرے

ذلت و رسوائی سے نہیں بچ سکے گا۔ اس لیے ایک دو دفعہ جرم کا ارتکاب تو شاید کرے لیکن عادی مجرم بن کر زندگی نہیں گزار سکتا۔

ہمارا موجودہ معاشرہ جاہلی معاشرہ ہے۔ اس لیے یہاں حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں پامال ہوتے ہیں۔ آپ کا یہ کہنا بجا ہے کہ جہاں عورت بے حیائی اور خیانت کی مرتکب ہو تو مرد غیرت کھاتا ہے۔ اسی طرح بعینہٖ اگر مرد بے حیائی اور بدکاری کا مرتکب ہو تو عورت غیرت کھاتی ہے۔ آپ یا دوسری خواتین کا اپنے رنگین مزاج شوہروں پر غیرت کھانا بالکل جائز ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ آپ کا احساس اور تکلیف بجا ہے۔ زندگی بھر تکلیف میں گزار دی، شوہر کو نہ قانون نے روکا، نہ معاشرے نے۔ دونوں نے اپنا فرض ادا نہ کیا۔ نفسانی خواہشات پوری کرنے کا شوق تو لوگوں کو بہت ہے لیکن جب کل باز پُرس ہوگی اور سزا سنائی جائے گی تو اس وقت ہوش اُڑ جائیں گے۔ لیکن اُس وقت پچھتانے اور واویلا کرنے کا کیا فائدہ؟

آپ کے سامنے کئی راستے ہیں: ایک یہ کہ جوانی میں تکلیف دہ زندگی بسر کر لی تو اب بڑھاپے میں اپنی عزت، اولاد کی حفاظت کی خاطر مزید صبر کریں۔ شاید اسی صبر کی بدولت آپ کے شوہر کو ہدایت نصیب ہو جائے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ عدالت کی طرف رجوع کر کے طلاق حاصل کر لیں اور پھر عدت کے بعد دوسری جگہ شادی کر لیں (اگرچہ ہمارے معاشرے میں نکاح جیسے جائز کام کی حوصلہ شکنی کی جاتی ہے اور اسے بے عزتی سمجھا جاتا ہے لیکن اگر مناسب رشتہ ملے تو اسے بے عزتی سمجھنے کے بجائے عزت سمجھنا چاہیے۔ اولاد کو بھی اس میں رکاوٹ ڈالنے کے بجائے حمایت کرنا چاہیے۔ یہ شرم کی بات نہیں ہے)۔ تیسری صورت یہ ہے کہ پنچایت کے ذریعے شوہر کی اصلاح کریں، یا طلاق حاصل کر لیں۔

ان تینوں صورتوں میں سے کون سی صورت اختیار کرنا بہتر ہے؟ یہ آپ کے سوچنے کا کام ہے۔ جلد بازی نہ کیجیے۔ خوب سوچ سمجھ کر اور قریبی رشتہ داروں سے مشورہ کر کے کوئی ایک صورت اختیار کر لیں۔ ہم حتمی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتے لیکن ہماری ناقص رائے میں پہلی صورت بہتر ہے۔ اس میں آپ یہ اضافہ کر سکتی ہیں کہ معاشرے کے اچھے، بااثر لوگوں کے ذریعے شوہر پر دباؤ ڈال کر اس کی اصلاح کی کوشش بھی کریں۔ واللہ اعلم (مولانا عبدالمالک)

کتاب نما

رسائل و مسائل (حصہ ہشتم)، شیخ الحدیث مولانا عبدالمالک۔ ناشر: ادارہ معارف اسلامی' لاہور۔ صفحات: ۴۱۳۔ قیمت: ۲۱۰ روپے۔

'رسائل و مسائل' کے زیرِعنوان جو روایت مولانا مودودی مرحوم نے قائم کی' اسے ان کے تربیت یافتہ افراد نے اپنے مقدور بھر زندہ رکھنے کی کوشش کی۔ چنانچہ جسٹس ملک غلام علی مرحوم اور خرم مراد مرحوم کے قلم سے نکلے ہوئے جوابات اس سے قبل کتابی شکل میں طبع ہو چکے ہیں۔ اب اسی سلسلے کو جاری رکھتے ہوئے ادارہ معارف اسلامی لاہور نے شیخ الحدیث مولانا عبدالمالک کے تحریر کردہ جوابات جو ۱۹۸۲ء سے ۲۰۰۱ء کے دوران ترجمان القرآن میں طبع ہوئے ہیں' ایک جلد میں شائع کر دیے ہیں۔ کتاب ۱۱ ابواب اور چار مقالات پر مبنی ہے۔ ابواب کے عنوانات یوں ہیں: ○ تفسیر آیات و تاویلِ احادیث ○ عقائد و ایمانیات ○ نماز ○ روزہ ○ قربانی ○ زکوٰۃ ○ معاشی مسائل ○ معاشرتی مسائل ○ عالمِ نسواں ○ متفرق مسائل ○ دعوت و تحریک۔ مقالات میں اجماعِ اُمت' مختلف مسالک پر عمل' خلافت کا استحقاقِ جہاد شامل ہیں۔

مولانا عبدالمالک کی فقہی آرا ان کی بصیرت کا روشن ثبوت ہیں۔ مولانا عموماً معروف حنفی مصادر کے حوالے سے اپنی رائے کا اظہار فرماتے ہیں لیکن اعتدال و توازن کو کبھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ اسی بنا پر بعض حساس موضوعات پر بھی ان کی رائے کسی فریق کے جذبات کو مجروح نہیں کرتی۔ اس کی عمدہ مثال مشرک کے پیچھے نماز (ص ۸۶-۸۷)' بریلوی امام کے پیچھے نماز (ص ۶۱ تا ۸۲) جیسے موضوعات پر تحریر کردہ جوابات ہیں۔ باب ہفتم اس لحاظ سے بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ اس میں جدید معاشی مسائل پر مدلل آرا کا اظہار کیا گیا ہے۔ ادارہ معارف اسلامی اس کتاب کو طبع کرنے پر مبارک باد کا مستحق ہے۔ (ڈاکٹر انیس احمد)

قرارداد مقاصد کا مقدمہ، سردار شیر عالم، چودھری محمد یوسف: ناشر: الشریعہ اکادمی، ہاشمی کالونی۔ کنگنی والا، گوجرانوالہ۔ فون: ۴۰۰۳۹۴-۰۵۵۔ صفحات: ۲۰۶۔ قیمت: ۱۲۰ روپے۔

اسلام پر پاکستان کی نظریاتی اساس کسی شک وشبہے سے بالاحقیقت ہے۔ تاہم، قیامِ پاکستان کے روز ہی سے، پاکستان میں اسلام اور سیکولرزم کی بحث شروع ہوگئی تھی۔ ۱۲ مارچ ۱۹۴۹ء کو پہلی دستور ساز اسمبلی نے اس بحث کا مسکت جواب 'قرارداد مقاصد' کی منظوری کی صورت میں دیا، اور پاکستان کی نظریاتی سمت کو قرارداد مقاصد کے آئینی اور قانونی اعتبار سے متعین کر دیا۔ بعدازاں ۱۹۵۶، ۱۹۶۲ء اور ۱۹۷۳ء کے دساتیر میں اسے محض دیباچے میں جگہ دی گئی ہے اور ریاست وحکومت اس سے بے نیاز رہے۔ البتہ ۱۹۷۲ء میں جسٹس حمودالرحمٰن نے 'عاصمہ جیلانی کیس ۱۹۷۲ء' میں اس دستاویز کی اہمیت اور دساتیر میں نظرانداز کرنے کے المیے کی جانب لطیف پیرایے میں توجہ دلائی۔

جنرل محمد ضیاءالحق نے قرارداد مقاصد کو دستور کے مقدمے کے بجائے دستور کا مؤثر حصہ بنا دیا۔ جس کے بعد لاہور ہائی کورٹ نے 'سکینہ بی بی کیس ۱۹۹۲ء' میں فیصلہ دیا کہ دفعہ ۴۵ میں مندرج صدر پاکستان کے اختیارات، قرآن وسنت کے پابند ہیں۔ مگر سپریم کورٹ نے 'حاکم خاں کیس ۱۹۹۲ء' میں اس کے برعکس فیصلہ دیا:

۱- قرارداد مقاصد کی حیثیت کو محدود کر کے ایک رسمی خواہش کے دائرے میں بند کرنے کی کوشش کی۔ سردار شیر عالم ایڈووکیٹ [م: ۱۰ اپریل ۲۰۰۷ء] نے اس فیصلے کی شدت کو قلب وروح کی گہرائیوں میں محسوس کیا، اور اس کا فکری، دستوری اور اسلامی بنیادوں پر نہایت فاضلانہ تجزیہ تحریر کیا۔ جس نے سپریم کورٹ کے فیصلے سے پیدا شدہ صورت حال کو زیرغور لانے کے لیے سنجیدہ بنیاد فراہم کی۔

زیرنظر کتاب کا مرکزی حصہ اسی مقالے کا رواں اُردو ترجمہ (ص ۱۲۵-۱۸۹) چودھری محمد یوسف نے کیا ہے، جب کہ اسی مناسبت سے چند تحریریں اور ۱۹۹۲ء کے مذکورہ دونوں فیصلوں کا بھی ترجمہ پیش کر دیا گیا ہے۔ (سلیم منصور خالد)

پنجاب کے آثارِ قدیمہ، ڈاکٹر محمد اقبال بھٹہ۔ علم و عرفان پبلشرز' ۳۴- اُردو بازار' لاہور۔ فون: ۷۲۳۲۳۳۶۔ صفحات: ۲۰۵۔ قیمت: ۲۰۰ روپے۔

اگرچہ آثارِ قدیمہ کو محض عمارات تک محدود نہیں کیا جاسکتا' تاہم عرفِ عام میں مذکورہ ترکیب سے 'عمارات' ہی مراد لی جاتی ہیں اور زیرنظر کتاب میں بھی اسی حوالے سے مختلف النوع عمارات کے بارے میں تاریخی حقائق اور صورتِ واقعہ پر مبنی' مفید معلومات بہم پہنچائی گئی ہیں۔

فاضل مصنف آثارِ قدیمہ کے مختلف اداروں اور شعبوں سے وابستہ رہے' باقاعدہ خطاط بھی ہیں۔ اس فن میں انھیں حافظ یوسف سدیدی مرحوم' سید نفیس رقم اور صوفی خورشید رقم کا تلمذ حاصل ہے۔ ان دنوں پنجاب انسٹی ٹیوٹ آف لینگوئج' آرٹ اینڈ کلچر (حکومت پنجاب) میں بطور ڈپٹی ڈائرکٹر کام کر رہے ہیں۔

زیرنظر کتاب میں آٹھ باغات (ہرن منار' شالامار' بارہ دری وزیرخاں' چوبرجی وغیرہ) ۱۲ مقبروں (نورجہاں' آصف خاں' انارکلی' مہابت خاں' علی مردان وغیرہ) دس قلعوں (اٹک' روات' شاہی قلعہ وغیرہ) اور آٹھ مساجد (وزیرخاں' چینیاں والی' حمام والی اور بادشاہی مسجد وغیرہ) کے بارے میں خاصی تحقیق اور تجسس کے بعد تاریخی معلومات' حوالوں اور اعداد و شمار کے ساتھ فراہم کی گئی ہیں۔ تصاویر بھی شامل ہیں۔

'پنجاب کے فنِ تعمیر' کے تذکرے میں مصنف کا یہ تاثر درست معلوم نہیں ہوتا کہ پنجاب اپنا کوئی منفرد فنِ تعمیر رکھتا ہے' یا یہاں 'ایک خاص فنِ تعمیر کی بنیاد' رکھی گئی۔ دراصل پنجاب کی مساجد' مقبروں اور مختلف عمارتوں میں بے حد تنوع ہے اور یہ اس لیے ہے کہ یہ فنِ تعمیر اسلامی اور ہندی تہذیب و تمدن کی روایات اور افغانی اور وسط ایشیائی حملہ آوروں کے اثرات کے نتیجے میں تشکیل پذیر ہوا۔ اس اعتبار سے پنجاب کا فنِ تعمیر مختلف تعمیراتی فنون کا جامع ہے اور اسی لیے اس کے مختلف علاقوں میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر مکانات اور مقبروں حتیٰ کہ عام قبروں تک کی شکل و صورت بھی بدل جاتی ہے۔

کتاب خاصی محنت و کاوش سے لکھی گئی ہے۔ تعجب ہے کہ ۳۷ مآخذ کی فہرست (کتابیات) میں ان اُردو کتابوں کے نام نہیں دیے گئے جو 'حوالہ جات' کے تحت مذکور ہیں۔ کتاب میں فنی تدوین

کی کمی بھی محسوس ہوتی ہے۔ اتنی اچھی تحقیقی کتاب میں فنی تدوین کی کمی اور فنِ اِملا و رموزِ اوقاف سے بےتوجہی کھٹکتی ہے۔(رفیع الدین ہاشمی)

اُردو املا، رشید حسن خاں۔ ناشر: مجلس ترقی ادب، کلب روڈ، لاہور۔ فون: ۶۳۶۸۲۱۸۔ صفحات: ۷۰۶۔ قیمت: ۳۰۰ روپے۔

رشید حسن خاں کا نام اُردو زبان کے ایک نمایاں محقق اور زبان، لغت اور املا کی اصلاح و ترقی کے حوالے سے کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ اپنے موضوع پر ان کی زیرنظر تصنیف ایک اہم تحقیقی کاوش ہے، جو بھارت کے سرکاری اشاعتی ادارے سے دو بار شائع ہوئی اور اپنی افادیت کے باعث طلبہ، قارئین اور علما و محققین میں مقبول ہوچکی ہے۔

کتاب کا دیباچہ بجاے خود ایک تصنیف کا درجہ رکھتا ہے۔ اس میں محقق نے رسمِ خط اور املا، املا میں تغیّر اور اصلاح، اصلاح اور صحت، خطاطی، رسمِ خط اور املا اور املا کی معیار بندی کے بعد املا کی ازسرنو تعریف متعین کی ہے۔ انھوں نے مرکبات کی درست املا اور مرکبات کو الگ الگ لفظوں میں لکھنے کے بارے میں بھی تفصیلی گفتگو کی ہے۔

کتاب عملاً چار حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصّے میں املا کے مسائل کو الف بائی انداز میں منضبط کیا گیا ہے۔ الف (الف ممدودہ، الف اور ہاے مختفی، الف تنوین)، ت ۃ، ت ط، ذ ز ژ، س ص ض، ک گ، ن و، ہ (ہاے ملفوظ، ہاے مختفی، ہاے مخلوط)، ہمزہ (ہمزہ اور الف، ہمزہ اور واو، ہمزہ اور ہاے مختفی، ہمزہ اور ی) وغیرہ پر مفصل بحث کر کے املا کے مسائل کو حل کرنے کی کوشش کی ہے۔ دوسرے حصّے میں گنتیاں، لفظوں کو ملا کر لکھنا، نقطے، شوشے، حرفوں کے جوڑ، نسخ و نستعلیق کی بعض خصوصیات اور اعراب، علامات اور رموزِ اوقاف کے بارے میں گفتگو کی ہے۔ تیسرا حصّہ املاے فارسی کی ذیل میں ہندستانی فارسی اور کلاسیکی ایرانی فارسی کے املا اور املاے فارسی جدید کے لیے مختص کیا گیا ہے، جب کہ چوتھے حصّے میں تدوین اور املا، اور لغت اور املا جیسے اہم موضوعات کو چھیڑا گیا ہے۔ آخر میں بعض اہم الفاظ کا اشاریہ دے دیا گیا ہے۔

محقق نے اپنی تصنیف میں ماضی میں املا کے مسائل کے بارے میں لکھی جانے والی مستند

اور قابلِ قبول تحریروں کی مدد سے اصول و قواعد مرتب کیے ہیں اور انھی کی روشنی میں دیگر الفاظ کو قیاس کے دائرے میں لایا گیا ہے، تاہم اس بات کا خیال رکھا گیا ہے کہ مسلمات کی خلاف ورزی ہو اور نہ خواہ مخواہ کی جدت طرازی۔

امید ہے کہ مجلس ترقی ادب، شہزاد احمد کی سرپرستی میں علم دوستی کا ثبوت فراہم کرتے ہوئے اسی معیار کی کتابیں شائع کرتی رہے گی۔ (ڈاکٹر خالد ندیم)

ہم کیوں مسلمان ہوئیں؟ مرتبین: اُم فریحہ/سیف اللہ ربانی۔ ناشر: ادارہ مطبوعات خواتین، بالمقابل تعمیر سیرت کالج، منصورہ ملتان روڈ، لاہور۔ فون: ۴۱۳۶۴۵۸-۰۳۰۰۔ صفحات: ۵۵۸۔ قیمت: ۲۵۰ روپے۔

عصرِ حاضر میں، اسلام کی تیز رفتار اشاعت اور کثرت سے غیر مسلم افراد کا مشرف بہ اسلام ہونا اس بات کا عملی ثبوت ہے کہ ہر دور کی طرح اسلام آج بھی زندہ اور متحرک قوت ہے، اور انسانیت کا واحد نجات دہندہ بھی۔ یہ انسان کی مادی اور روحانی ضرورت کو بہ طریق احسن پورا کرتا ہے۔ یہ کائنات کا فطری دین ہے جو بنی آدم کو سکونِ قلب جیسی لازوال نعمت عطا کرتا ہے۔

کتاب کا ابتدائیہ متاثر کن اور اپنے موضوع پر کئی حوالوں سے معلومات افزا ہے۔ طرزِ نگارش عمدہ ہے۔ یہ اسلام قبول کرنے والی خواتین کا ایک انسائیکلوپیڈیا ہے جس میں دنیا کے مختلف ممالک کی ۱۰۰ سے زائد نومسلم خواتین کے قبولِ اسلام کی سچی داستانیں اور ان کے انٹرویو شامل ہیں۔ یہ ایمان افروز، روح پرور اور وجد آفرین سوانح عمریاں جو سبق آموز ہونے کے ساتھ دل چسپ خودنوشت کا رنگ لیے ہوئے ہیں، بلاشبہہ ایسی قابلِ فخر مثالیں ہیں جنھیں عام کیا جانا چاہیے۔

ان خواتین کے زندہ و بیدار ایمان، ان کی طلبِ علم اسلام، ان کے اندر کام کرتا ہوا جذبۂ تعمیر اور جس استقامت و عزیمت سے انھوں نے راہِ حق میں پہنچنے والی ایذاؤں کو برداشت کیا، کو دیکھ کر قاری اپنے ایمان میں تازگی، سرور اور مزید پختگی محسوس کرتا ہے اور ایک جذبۂ ندامت بھی کہیں جاگتا ہے کہ ہم کیوں شعوری اور عملی مسلمان نہیں بن پا رہے؟

امید ہے کہ مرتبین کی یہ کاوش دعوتِ اسلامی کے فروغ میں مفید ثابت ہوگی۔ مسلمانوں اور

خصوصاً غیرمسلم اصحاب کو بطورِ تحفہ پیش کرنے کے لیے ایک بہتر چیز ہے۔ کیا خبر کون سی بات کس کے لیے ہدایت کا سبب بن جائے۔ (ربیعہ رحمٰن)

مولانا مودودی کے حوالے سے علماے کرام کی خدمت میں، شفیق الرحمٰن عباسی۔ ناشر: اعلیٰ مطبوعات، اُردو بازار، لاہور۔ صفحات: ۵۶۵۔ قیمت: ۲۵۰ روپے۔

مولانا مودودی علیہ الرحمہ کو زندگی میں ایک جانب ملحدین، اباحیت پسندوں، کمیونسٹوں، قادیانیوں اور منکرین حدیث وغیرہ کی تنقید کا سامنا کرنا پڑا تو دوسری جانب متعدد علما نے بھی اس تنقیدی یلغار میں حسبِ توفیق اپنا حصہ ڈالا۔ مولانا مودودی مرحوم کے فاضل رفقا میں سے چند احباب نے بروقت اس تنقید کا جائزہ لیا اور علمی پہلوؤں سے بھی تجزیہ پیش کیا۔ زیرنظر کتاب درحقیقت انھی جوابی تحریروں کے چیدہ چیدہ اقتباسات کے ساتھ پیش کی گئی ہے۔

جن موضوعات پر اقتباسات کو پیش کیا گیا ہے، فی زمانہ ان حوالوں سے مولانا مودودی پر کم ہی تنقید کی جاتی ہے، البتہ 'نائن الیون' کے بعد کے حالات میں انھیں دوسرے موضوعات کی بنیاد پر ہدفِ تنقید بنایا جا رہا ہے اور اس کام میں بھی مقدس اور غیرمقدس دونوں حلقے اپنا کام کر رہے ہیں۔ مثال کے طور پر: اسلام اور ریاست کا تعلق، عورتوں کے حقوق، اسلام: جہاد یا دہشت گردی، دعوت کی ذمہ داری، فریضۂ اقامتِ دین کی حقیقت وغیرہ۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اس پروپیگنڈے کا مناسب جواب دیا جائے۔ کتاب کی تدوین میں ضمنی سرخیوں کے اضافے، اشاریے کی تدوین اور تمام حوالہ جات کی صحت کے اہتمام سے کام کی اہمیت دوچند ہو جاتی۔ (س-م-خ)

استاد: ملت کا محافظ، پروفیسر ثریا بتول علوی۔ ناشر: تنظیم اساتذہ پاکستان (خواتین)۔ تنظیم منزل، بہاول شیر روڈ، مزنگ، لاہور۔ صفحات: ۱۳۶۔ قیمت: ۷۵ روپے۔

ہر عہد کے اپنے تقاضے اور چیلنج ہوتے ہیں جن سے باخبر رہنا ایک استاد کے لیے ناگزیر ہے، اس لیے کہ معمارِ قوم کی حیثیت سے اسے ایک نسل کی تربیت کرنا ہوتی ہے جسے مستقبل کے چیلنجوں کا سامنا ہے۔ زیرنظر کتاب، مصنفہ نے اسی مقصد کے پیشِ نظر تحریر کی ہے۔ اس کی ضرورت اس لیے بھی پیش آئی کہ نائن الیون کے سانحے کے بعد اُمت مسلمہ کو نئے مسائل کا سامنا تھا۔

تعلیم‘ نصابِ تعلیم اور نظامِ تعلیم کے اصول ومبادی اور اصولی مباحث‘ نیز تعلیم کے نام پر کی جانے والی سازشوں کے علاوہ موجودہ تعلیمی منظرنامہ‘ سیکولر نظامِ تعلیم اور درپیش جدید چیلنج زیربحث آئے ہیں۔ معلم اعظمؐ کا اسوۂ حسنہ‘ مثالی نظامِ تعلیم‘ تعمیر معاشرہ میں استاد کا کردار اور جدید چیلنجوں کا سامنا کرنے کے لیے اصولی رہنمائی دی گئی ہے‘ جب کہ خواتین اساتذہ کے خصوصی کردار پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ (حمید اللہ خٹک)

لال مسجد کا لہو، اصغر عبداللہ۔ ناشر: نگارشات پبلشرز‘ ۲۴- مزنگ روڈ‘ لاہور۔ فون: ۷۳۲۲۸۹۲۔ صفحات: ۱۵۲+۸۔ قیمت: ۱۲۰ روپے‘ مع اشاریہ۔

دسمبر ۱۹۹۲ء میں ہندو جنونیوں نے بابری مسجد کو شہید کیا‘ مگر اس المیے کے دوران کم از کم کوئی مسلمان اس مسجد میں موجود نہیں تھا۔ جولائی ۲۰۰۷ء کو لال مسجد اسلام آباد کو وحشیانہ فائرنگ کا نشانہ بنایا گیا اور اس سے منسلک جامعہ حفصہ کی طالبات کو زمینی اور فضائی فائرنگ کے نتیجے میں کیمیاوی ہتھیاروں کی بارش سے جلا کر راکھ کر دیا گیا۔ جامعہ کے منتظمین کے بقول ایک ہزار سے زائد مسلمان طالبات بھی شہید ہوگئیں۔ صد افسوس کہ یہ حادثہ مملکت خداداد پاکستان میں ہوا۔

اس سانحے کے اسباب‘ کردار اور نتائج پر بحث ہوتی رہے گی‘ اور اس کرب کی ٹیسیں مدتوں تک محسوس کی جاتی رہیں گی۔ زیرنظر کتاب کے فاضل مؤلف نے غیر جذباتی انداز میں مسئلے کے کرداروں کو بے نقاب کرنے اور جامعہ پر حملے کے ’جواز‘ کا مؤثر استدلال سے جواب دینے کی قابلِ ستایش کوشش کی ہے۔ ایک رخ تو وہ تھا جسے حکومتی حلقوں نے اشتہاروں اور کالموں کی صورت میں شائع کیا اور شب و روز ریڈیو ٹی وی سے الاپا۔ اس یک رخی ابلاغی جارحیت کا ایک جگہ پر جواب بڑی حد تک کتاب کے باب ’تصویر کا دوسرا رخ‘ (ص ۱۷-۴۹) میں پیش کیا گیا ہے۔

کتاب میں مرزا محمد اسلم بیگ‘ پروفیسر خورشید احمد‘ سمیحہ راحیل قاضی‘ ڈاکٹر شاہد مسعود‘ مولانا زاہد الراشدی‘ مفتی محمد رفیع عثمانی‘ مولانا فضل الرحمٰن خلیل‘ مولانا عبدالعزیز‘ غازی عبدالرشید‘ چودھری شجاعت حسین اور جنرل پرویز مشرف کی تحریر وتقریر کے متعلقہ حصوں کو سلیقے سے پیش کیا گیا ہے۔ ایک انفرادیت شہید ہونے والی جامعہ حفصہ کی نایاب تصاویر ہیں۔ (س-م-خ)

تعارف کتب

◉ **قوم پرستی اور اس کے نقصانات**، مولانا مرغوب احمد لاجپوری۔ ناشر: بیت العلم ٹرسٹ، ایس ٹی/۹-ای، بلاک ۸، گلشن اقبال، کراچی۔ صفحات: ۴۶۔ قیمت: ۶۰ روپے۔[قوم پرستی ہمارے ملک کے اہم ترین سیاسی مسائل میں سے ایک ہے۔ وعظ و تلقین اس مسئلے کا حل نہیں۔ یہ گہرے مطالعے اور عملی تدابیر کا تقاضا کرتا ہے۔ مصنف نے قرآن و حدیث کی روشنی میں عصبیت کے مہلک مرض کی مذمت کی ہے اور نتائج سے خبردار کیا ہے۔]

◉ **عنایت علی خان، شخصیت و فن**، مرتبین: محمد افضال، عبداللطیف انصاری۔ ملنے کا پتا: مکان نمبر ۱۶۲۲، اقبال کالونی، یونٹ نمبر ۱۲، لطیف آباد، حیدر آباد، سندھ۔ صفحات: ۲۷۲۔ قیمت: ۱۵۰ روپے۔[عنایت علی خان خوش قسمت ہیں کہ ان کے دوستوں نے انھیں زندگی ہی میں خراجِ تحسین پیش کر دیا۔ ان کے مزاحیہ اور غیر مزاحیہ کلام کا انتخاب، کچھ مضامین، خصوصی انٹرویو اور دوستوں کے مضامین شامل اشاعت ہیں۔ ان کی باغ و بہار، ہمہ جہت اور متنوع شخصیت کی بہت اچھی جھلک۔]

◉ **خاندانی منصوبہ بندی سے متعلّق چند فکری مغالطے**، ریاض الرحمٰن قریشی۔ بہاؤالدین زکریا یونی ورسٹی، ملتان۔ صفحات: ۱۴۰۔ قیمت: درج نہیں۔[خاندانی منصوبہ بندی کے بارے میں دینی حلقوں کا موقف معروف ہے لیکن جب انھی میں سے کوئی ان کے حق میں لکھے تو کچھ لوگوں کو الجھن ہو جاتی ہے۔ مصنف نے اپنے ایک صاحبِ علم دوست کے ایسے ہی بعض مغالطوں کو دُور کرنے کی کوشش کی ہے۔ اچھی بات یہ ہے کہ ان کی تحریر بھی مکمل دی ہے۔]

◉ **الصرف الجمیل** (الجزء الاوّل، الجزء الثانی)۔ تالیف: الاستاذ محمد بشیر۔ ناشر: دارالعلم، ۶۹۹ آبپارہ مارکیٹ، اسلام آباد۔ صفحات، اوّل: ۱۲۸، دوم: ۱۹۶۔ قیمت بالترتیب: ۵۰ روپے، ۱۰۰ روپے۔[اس کتاب میں مؤلف نے عربی زبان کے افعال کی گردانوں اور ان کے روزمرہ استعمال کو مؤثر اور سہل اسلوب میں پیش کیا ہے۔ عام فہم اور ہر قاری کے لیے مفید، خصوصاً مدارسِ عربیہ میں زیرِ تعلیم طلبہ و طالبات کے لیے گراں قدر سرمایہ۔ عربی گرامر کے قواعد و ضوابط کو تصاویر کے ذریعے سمجھایا گیا ہے۔]

◉ **You Can Climb Up**، محمد بشیر جمعہ۔ ٹائم مینجمنٹ کلب، پوسٹ بکس ۱۲۳۵۶، ڈی ایچ اے، کراچی-۷۵۵۰۰۔ صفحات: ۱۱۲۔ قیمت: ۶۰ روپے۔[کامیابی کی شاہراہ پر سفر کرانے کے لیے بشیر جمعہ کا نام محتاجِ تعارف نہیں۔ اس مختصر کتاب میں انھوں نے مطالعے اور امتحان کے طریقے، وقت کا بہترین استعمال اور کیریئر کی منصوبہ بندی جیسے موضوعات کا احاطہ کیا ہے۔]

مدیر کے نام

عبدالرشید عراقی ' سوہدرہ گوجرانوالہ

'ازواج مطہراتؓ کا اسلوب دعوت' (نومبر ۲۰۰۷ء) کے ذریعے اُمہات المومنینؓ کی سیرت کا ایک اہم پہلو نمایاں ہوکر سامنے آیا۔ موجودہ دور میں اُن مستورات کو جو دعوتِ دین کا فریضہ انجام دے رہی ہیں ازواجِ مطہراتؓ کی پیروی کرتے ہوئے امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا فریضہ بلاخوف ادا کرنا چاہیے۔ اس لیے بھی کہ موجودہ حالات میں اس کی شدید ضرورت ہے۔

عبدالرؤف ' لاہور

'فوج، وزیرستان اور پروفیشنل ازم' (نومبر ۲۰۰۷ء) قابلِ غور ہے۔ اُمت مسلمہ کی یہ بدقسمتی ہے کہ اس کے تمام سیاسی اور انتظامی ادارے فوج کے تسلط میں ہیں۔ اُمت مسلمہ کے مسائل سے دل چسپی رکھنے والے حضرات بالخصوص اسلامی تحریکوں کو فوج اور بیوروکریسی کے نظام کا گہرا مطالعہ اور ناقدانہ جائزہ لینا چاہیے' اور پاکستانی معاشرے اور دیگر مسلم معاشروں کو پیش نظر رکھ کر اثرنفوذ کی راہیں تلاش کرنی چاہییں اور حکمت عملی مرتب کرنی چاہیے۔

آصف محمود وینس ' لاہور

'قصہ کشکول ٹوٹنے اور قرضوں کے انبار بڑھ جانے کا' (اکتوبر ۲۰۰۷ء) میں آپ نے جس طرح اعداد وشمار کی روشنی میں پاکستان کی اقتصادی حالت اور ہماری ملکی معیشت پہ آئے دن بیرونی قرضوں کے اضافے کا تجزیہ پیش کیا' وہ قابلِ تحسین ہے۔ امید ہے آیندہ کسی اشاعت میں 'بیرونی قرضوں کی ادایگی اور پرائیویٹائزیشن' کے موضوع پر بھی لکھیں گے کیونکہ پرائیویٹائزیشن کے حق میں حکمرانوں کا موقف تھا کہ اس سے حاصل ہونے والی رقم سے قرضوں کی ادایگی ہوگی۔ کیا واقعی ایسا ہوا؟

سلیم شاکر ' سعودی عرب

محترمہ شمع سلیم کا مضمون 'مومن کا وصیت نامہ' (اکتوبر ۲۰۰۷ء) زیرمطالعہ رہا۔ انھوں نے اس مضمون میں بہت خوب صورتی ' سلیقے سے اور مؤثر انداز میں وصیت کا ایک پیارا سا خاکہ کھینچا ہے۔ اللہ انھیں اجرعظیم سے نوازے۔ آمین! یہ مضمون واقعی اور حقیقی معنوں میں ان کا وصیت نامہ بھی بن گیا۔ اس مضمون کی اشاعت کے بعد ۱۳ اکتوبر ۲۰۰۷ء کو کار کے ایک حادثے میں وہ جاں بحق ہوئیں۔ انا للّٰہ وانا الیہ راجعون

ڈاکٹر رئیس احمد نعمانی ،علی گڑھ، بھارت

ستمبر ۲۰۰۷ء کے شمارے میں تنویر المقیاس من تفسیر ابن عباس کے ترجمے پر تبصرہ شائع ہوا ہے۔ اس سلسلے میں مولانا تقی عثمانی کی مندرجہ ذیل عبارت قابلِ توجہ ہے: ''ہمارے زمانے میں ایک کتاب تنویر المقیاس من تفسیر ابن عباس کے نام سے شائع ہوئی ہے، جسے آج کل عموماً تفسیر ابن عباسؓ کہا جاتا ہے اور اس کا اُردو ترجمہ بھی شائع ہوگیا ہے۔ لیکن حضرت ابن عباسؓ کی طرف اس کی نسبت درست نہیں، کیونکہ یہ کتاب محمد بن مروان السدی عن محمد بن السائب الکلبی عن ابی صالح عن ابن عباسؓ کی سند سے مروی ہے اور اس سند کو محدثین نے سلسلۃ الکذب (جھوٹ کا سلسلہ) قرار دیا ہے، لہٰذا اس پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔ (علوم القرآن، مولانا محمد تقی عثمانی، ص ۴۵۸)

عامر شکیل ،لاہور

آج کل کچھ جدید موبائل آرہے ہیں جن میں میموری کارڈ (memory card) ہوتا ہے۔ میں اس کارڈ میں سمعی تفہیم القرآن کے رکوعات محفوظ کرلیتا ہوں اور سفر کے دوران، دفاتر میں، انتظار کرتے ہوئے یا دیگر اوقات میں سنتا رہتا ہوں۔ یقیناً موبائل کی اِس جدت کا یہ سب سے بہتر استعمال ہے۔ اللہ تعالیٰ تفہیم القرآن کے مصنف، اور اُس کو 'سمعی' میں منتقل کرنے والی ٹیم کو جزائے خیر سے نوازے۔ ترجمان کی ٹیم کے لیے بھی بہت دعائیں۔ آمین!

ڈاکٹر محمد ایوب خان ،لاہور کینٹ

اکثر اُردو مترجم قرآن سورۂ اخلاص کی پہلی آیت کے الفاظ ھُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ کا ترجمہ ''وہ اللہ ایک ہے'' غلط کر جاتے ہیں۔ چونکہ یہ بات صحیح ہے اس لیے انھیں خیال نہیں آتا۔ صحیح ترجمہ ہے: ''وہ اللہ ہے اکیلا''۔ انگریزی مترجم غلطی نہیں کرتے کیونکہ وہ ھُوَ کا ترجمہ جب He کرتے ہیں تو وہ خودبخود He is God, the one کرتے ہیں۔ تفہیم القرآن میں مولانا مودودی علیہ الرحمۃ نے ''وہ اللہ ہے یکتا'' لکھا ہے۔

ایک اور بات کو سمجھنا بھی ضروری ہے۔ عام مشہور کردیا گیا ہے کہ اللہ خدا کا اصلی نام ہے، جیسے ہم سب کے نام ہیں۔ اس لیے اس کا ترجمہ خدا، یا God نہیں کرنا چاہیے، یہ غلط ہے۔ عرب باقی بت پرست قوموں کی طرح بہت سے خداؤں کو مانتے تھے، ان کو اِلٰہ سمجھتے تھے۔ ان کے اوپر ایک بڑے خدا کو مانتے تھے جس نے یہ دنیا پیدا کی ہے اور سب حاجتیں پوری کرسکتا ہے۔ اسے ال الٰہ یا اللہ کہتے تھے۔ یہ بامعنی لفظ ہے اور اس کے معنی ہیں: ''جو ہر حاجت پوری کرسکے''۔ اگر اللہ اس کا اصطلاحی نام ہوتا تو سب زمانوں میں پایا جاتا۔ مگر ہر زبان کا اپنا نام ہے اور ترجمے میں اس زبان کا لفظ لکھنا ضروری ہے، ورنہ وہ سمجھے گا کہ 'اللہ' مسلمانوں کا بڑا بت ہے۔

نصف صدی سے زائد عرصے سے

انسانیت کی خدمت میں مصروفِ عمل



ہسپتال

ایلو پیتھک و ہومیو کلینک

ڈائیگنوسٹک سینٹر اور فارمیسی

ڈائیگنوسٹک کلیکشن پوائنٹس

میڈیکل کیمپس

حفاظتی ٹیکوں کی مہمات

مدارس تفہیم القرآن

کمیونٹی ریلیف

میت بس سروس

ایمرجنسی ریلیف

آپ کا اعتماد، غم سمیٹنے اور خوشیاں بانٹنے میں ہمارے ساتھ ساتھ......

آؤ مل کر خوشیاں بانٹیں دست تعاون بڑھایئے...

اپنی عید اور قربانی میں شریک کریں

✓ مظلوم کشمیری ماؤں، بہنوں، بچوں اور بھائیوں کو ✓ کراچی میں رہنے والے بے وسیلہ خاندانوں کو

✓ زلزلہ زدگان صوبہ سرحد، آزاد کشمیر

(مظفر آباد، باغ، مانسہرہ، ایبٹ آباد، بالاکوٹ، راولاکوٹ ودیگر)

بکرا / دنبہ 6500 روپے

گائے (فی حصہ) 3500 روپے

الخدمت ویلفیئر سوسائٹی (رجسٹرڈ) کراچی

504، قائدین کالونی، نزد اسلامیہ کالج، کراچی۔ فون: 4912568, 4915361 (21-92)، فیکس: 4120417 (21-92)

ای میل: alkhidmat@cyber.net.pk ، ویب سائٹ: www.alkhidmat.org.pk

اکاؤنٹ نمبر: 6-6 مسلم کمرشل بینک، پی ای سی ایچ ایس علامہ اقبال روڈ برانچ، کراچی

حسین فاروق مودودی نے ملک عید محمد پرنٹرز سے چھپوا کر ۵-اے ذیلدار پارک' اچھرہ' لاہور سے شائع کیا

Madina Tul Ilm

قرطبہ سٹی

امن اور علم کی بستی اکیسویں صدی کا محورِ تعلیم و تحقیق



محلِ وقوع و آب و ہوا:

قرطبہ سٹی کے لئے جگہ کا انتخاب چکری انٹرچینج ،موٹروے (M2) کے ساتھ کیا گیا ہے۔ یہ جگہ اسلام آباد، راولپنڈی سے 30 منٹ کی ڈرائیو (50 کلومیٹر تقریباً) پر تحصیل راولپنڈی میں واقع ہے۔کوہِ خیری مُورت کے دامن میں واقع یہ علاقہ قدرتی مناظر سے مالا مال ہے۔اس کا موسم اور نشیب و فراز اسلام آباد سے ملتے جلتے ہیں۔اس کے درمیان سے دریائے سِل بل کھاتا ہوا گزرتا ہے جس میں قدرتی چشموں کی وجہ سے سارا سال پانی کا بہاؤ رہتا ہے۔

شہری سہولیات و خصوصیات:

❀ تمام سہولیات جو ایک جدید شہر میں ہوتی ہیں ❀ شجر کاری اور اس کی مستقل دیکھ بھال گھروں کے معیاری نقشہ جات کی فراہمی۔
❀ قرطبہ سٹی کا اندرونی ٹرانسپورٹ کا نظام ❀ قرطبہ سٹی سے اسلام آباد، راولپنڈی تک ٹرانسپورٹ کی سہولت ❀ منصوبے کو آباد کاری کے دوران مالی لحاظ سے خودکفیل رکھنے کا نظام۔
❀ اسلامی معاشرتی اقدار کے فروغ کے لئے شہری زندگی اور ہمسائیگی کے خصوصی بائی لاز ❀ تمام شہری سہولیات کی فراہمی اور مستقل دیکھ بھال کا نظام۔

منصوبے کی خصوصیات:



❀ قرطبہ سٹی کے وسط میں وسیع و عریض بین الاقوامی قرطبہ یونیورسٹی کا قیام و انصرام۔ یہ یونیورسٹی جدید سائنسی اور معاشرتی علوم پر تحقیق اور اُن کو اسلامی قدروں میں ڈھالنے کا محوَر ہوگی۔ ❀ ایک عظیم الشان مرکزی جامع مسجد قرطبہ کا قیام و انصرام۔ یہ جامع مسجد یونیورسٹی سے ملحقہ ہوگی اور یونیورسٹی کے مقاصد کے حصول میں کلیدی کردار کی حامل ہوگی۔ ❀ خواتین کے لئے خصوصی کاروباری مراکز و تفریحی مقامات۔

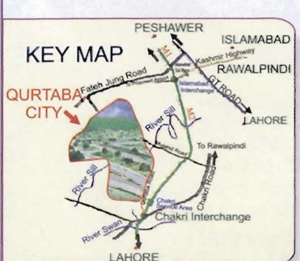
ترقیاتی کاموں کی صورتِ حال اور ماسٹر پلان:

❀ اس عظیم الشان منصوبے کے لیے 4 سے زائد ملحقہ موضع جات میں زمین کی خرید کی جاچکی ہے۔ اِن میں سے ایک موضع کی زمین کو یکجا کیا جا چُکا ہے (الحمدُ اللہ)۔ اور بقیہ موضع جات میں یکجا کرنے کا عمل جاری ہے۔ منصوبے کے حجم کے پیش نظر اس کی منصوبہ بندی اور تکنیکی کام مُلک کے مشہور اور مایہء ناز تکنیکی منصوبہ ساز اور کنسلٹنٹ میسرز نیسپاک (نیشنل انجینئرنگ سروسز پاکستان) کو سونپا گیا ہے۔ نیسپاک نے ایک جامع شہری منصوبہ پیش کر دیا ہے۔اور یکجا ہونے والے وسیع رقبہ کی منصوبہ بندی مکمل کر دی ہے۔ انجینئرز کا تیار کردہ ماسٹر پلان TMA کے پاس منظوری کے لئے جمع کروا دیا گیا ہے۔ اور تکنیکی مرحلوں سے گزر کر اب یہ ماسٹر پلان منظوری کے آخری مرحلہ میں ہے۔


قرطبہ سٹی پراجیکٹ آفس کا ایک منظر

پراجیکٹ آفس اور سائیٹ کا مشاہدہ:

❀ عظیم الشان منصوبے کی ضرورت کے مطابق تمام جدید سہولیات سے مزین پراجیکٹ آفس کی تعمیر مکمل ہو چکی ہے۔ اور جلد ہی انجینئرز اس آفس میں تعمیراتی کاموں کی نگرانی کا آغاز کر دیں گے۔ آپ سائیٹ کے مشاہدہ کے لیے چکری انٹرچینج موٹروے (M2) سے نکل کر اشارتی بورڈز کے مطابق پراجیکٹ آفس کا دورہ کر سکتے ہیں۔



پلاٹ بکُنگ:

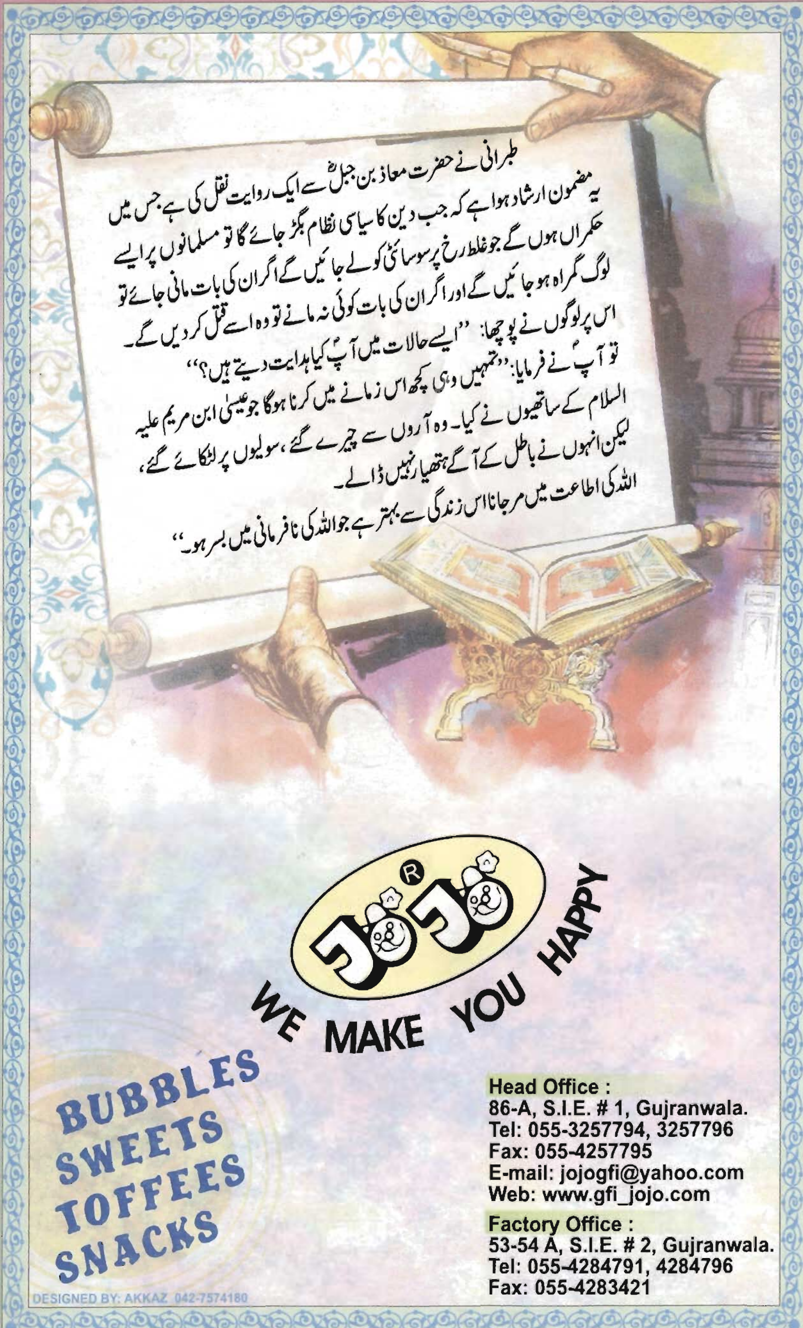
❀ ٹاؤن پلاننگ کی منظوری کے ساتھ ہی مزید پلاٹ بکُنگ کے لئے پیش کر دیے جائیں گے۔ اور ساتھ ہی الاٹمنٹ کا طریقہ کار اور نئی قیمتوں کا تعین بھی کر دیا جائے گا۔

موجودہ پلاٹ ہولڈرز متوجہ ہوں:

❀ قرطبہ سٹی کے دفتر سے رابطہ کر کے اپنا ڈاک کا پتہ درست کروائیں تاکہ ڈاک کی ترسیل یقینی بنائی جا سکے۔ ایڈریس تبدیل کرنے کے لئے فارم دفتر سے حاصل کریں۔ اقساط پر بکُنگ کروانے والے حضرات فوری طور پر اپنی بقایا اقساط جدول کے مطابق ادا کر دیں۔ بقایا جات جاننے کے لئے دفتر سے رابطہ قائم کریں۔ خواتین و حضرات اپنی رائے اور تجاویز سے مدینۃ العلم کے پتہ پر یا Email کے ذریعہ آگاہ کریں۔

مدینة العلم
فلیٹ نمبر 4، فسٹ فلور، خیبر پلازہ، فضل حق روڈ، بلیو ایریا، اسلام آباد
فون: 92-51-2206380 فیکس: 92-51-2270411
info@qurtabacity.com

Rev. 4.0


طبرانی نے حضرت معاذ بن جبلؓ سے ایک روایت نقل کی ہے جس میں
یہ مضمون ارشاد ہوا ہے کہ جب دین کا سیاسی نظام بگڑ جائے گا تو مسلمانوں پر ایسے
حکمراں ہوں گے جو غلط رخ پر سوسائٹی کو لے جائیں گے اگر ان کی بات مانی جائے تو
لوگ گمراہ ہو جائیں گے اور اگر ان کی بات کوئی نہ مانے تو وہ اسے قتل کر دیں گے۔
اس پر لوگوں نے پوچھا: ''ایسے حالات میں آپؐ کیا ہدایت دیتے ہیں؟''
تو آپؐ نے فرمایا: ''تمہیں وہی کچھ اس زمانے میں کرنا ہوگا جو عیسیٰ ابن مریم علیہ
السلام کے ساتھیوں نے کیا۔ وہ آروں سے چیرے گئے، سولیوں پر لٹکائے گئے،
لیکن انہوں نے باطل کے آگے ہتھیار نہیں ڈالے۔
اللہ کی اطاعت میں مرجانا اس زندگی سے بہتر ہے جو اللہ کی نافرمانی میں بسر ہو۔''
JOJO®
WE MAKE YOU HAPPY
BUBBLES
SWEETS
TOFFEES
SNACKS
Head Office :
86-A, S.I.E. # 1, Gujranwala.
Tel: 055-3257794, 3257796
Fax: 055-4257795
E-mail: jojogfi@yahoo.com
Web: www.gfi_jojo.com
Factory Office :
53-54 A, S.I.E. # 2, Gujranwala.
Tel: 055-4284791, 4284796
Fax: 055-4283421
DESIGNED BY: AKKAZ 042-7574180